مجلة المحصنات

علمی وتحقیقی رسالہ

ISSN 2523-11 11

شمارہ ۴

جون ۲۰۱۹ء

شعبہ تحقیق
جامعات المحصنات پاکستان

بسم الله الرحمن الرحيم

ISSN 2523-1111

مجلة المحصنات

علمی و تحقیقی مجلّہ

(اردو۔انگریزی۔عربی)

شمارہ: 4
جنوری تا جون 2019ء

مدیرہ
ڈاکٹر عابدہ سلطانہ
نگراں شعبہ تحقیق
جامعات المحصنات پاکستان

شعبہ تحقیق ۔ جامعات المحصنات پاکستان
مرکزی دفتر جامعات المحصنات: R-8 بلاک 8 عقب گلشن شمیم فیڈرل بی ایریا کراچی
فون: 0333-3050687 | 021-36320794 | 021-363711244
ویب: www.mohsanat.edu.pk | ای میل: almohsanatresearch@gmail.com
https//www.facebook.com//mohsanat1

مجلس ادارت ومشاورت

- مدیرہ: ڈاکٹر عابدہ سلطانہ
- معاون مدیرہ: شائستہ فخری

ادارتی بورڈ:

- ڈاکٹر سہیل شفیق — ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اسلامی تاریخ جامعہ کراچی
- ڈاکٹر جہاں آراء لطفی — اسسٹنٹ پروفیسر شیخ زید اسلامک سینٹر کراچی
- ڈاکٹر مولانا ساجد جمیل — شیخ الحدیث- سابق استاد جامعات المحصنات
- ڈاکٹر اسماء قیصر — شعبہ تحقیق جامعات المحصنات پاکستان

بین الاقوامی مشاورتی بورڈ:

- ڈاکٹر انور اللہ — اسلامک دعوۃ سینٹر برونائی دارلسلام
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی — ہیڈ آف عربی ڈیپارٹمنٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انڈیا
- ڈاکٹر مناظر احسن — اسلامک فاؤنڈیشن انگلینڈ
- ڈاکٹر عبدالودود — چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک لرننگ، جاگ ناتھ یونیورسٹی ڈھاکہ
- ڈاکٹر سید کفیل احمد قاسمی — چیئرمین شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انڈیا
- ڈاکٹر پرویز ناظر — یونیورسٹی آف کیمبرج انگلینڈ
- ڈاکٹر توقیر فلاحی — چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف سنّی تھیالوجی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انڈیا
- ڈاکٹر یٰسین مظہر — ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ ریسرچ انسٹیٹیوٹ انڈیا

قومی مشاورتی بورڈ:

- ڈاکٹر دوست محمد — ڈائریکٹر شیخ زید اسلامک سینٹر پشاور
- ڈاکٹر حسام الدین منصوری — سابق ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ کراچی یونیورسٹی
- ڈاکٹر عصمت اللہ — چیئرمین شعبہ فقہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی
- ڈاکٹر غزالہ رضوانی — ڈائریکٹر فیکلٹی آف فارمیسی ہمدرد یونیورسٹی کراچی
- ڈاکٹر معروف بن رؤف — اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ تعلیم کراچی یونیورسٹی
- ارشد احمد بیگ — ڈائریکٹر آرگنائزیشنل ڈیولپمنٹ اینڈ سپورٹ رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی
- پروفیسر ثریا قمر — چیئر پرسن شعبہ اسلامک اسٹیڈیز جناح یونیورسٹی برائے خواتین کراچی
- شاہنواز فاروقی — اسکالر، کالم نگار

مضامین کی اشاعت سے متعلق گزارشات

- مجلۃ المحصنات میں اسلامی ادب وعلوم، تاریخ وتہذیب، تقابل ادیان، فلسفہ، سماجی علوم، سیاسیات ومعاشرت وغیرہ سے متعلق موضوعات پر اردو۔ عربی اور انگریزی میں علمی وتحقیقی غیر مطبوعہ مقالات شائع کیے جاتے ہیں۔
- مضمون نگار اپنی تحریر کے دو نسخے A4 سائز کے کاغذ پر صفحہ کے ایک جانب اردو اور عربی کے مضامین ان پیج پر اور انگریزی کے مضامین ایم ایس ورڈ پر کمپوز کر کے ارسال کریں گے۔ جبکہ ایک نسخہ بذریعہ ای میل بھیجیں۔
- اپنے مضامین درج ذیل ای میل ایڈریس پر فراہم کریں۔

almohsanatresearch@gmail.com

- تحریر ارسال کرتے ہوئے اپنا مکمل نام، خط وکتابت کا پتہ، فون نمبر، ای میل ایڈریس بھی لازماً درج کریں۔
- تحقیقی مقالہ لکھنے کی صورت میں اس کی ابتداء میں 200 الفاظ پر مشتمل خلاصہ (abstract) HEC کے قواعد کے مطابق انگریزی میں تحریر کیجیے۔
- مقالے کا عنوان اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں درج کیا جائے۔
- مجلۃ المحصنات میں مراجع اور حواشی کے لیے APA طریقہ کار اپنایا جائے۔
- یہ بات پیش نظر رہے کہ مقالہ اس سے پہلے کسی اور مجلّہ یا رسالے میں شائع نہ ہوا ہو۔
- تمام تحریریں ادارے کی طرف سے نامزد کردہ ماہرین کی آراء کے بعد شائع کی جائیں گی۔ نیز نا قابل اشاعت تحریروں کی مصنفین کو واپسی ادارے کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔
- اشاعت کے لیے قبول کیے جانے والے مقالات میں ادارہ ضروری ادارتی ترمیم وتلخیص کا حق محفوظ رکھتا ہے۔
- ہر مضمون نگار/ مقالہ نگار کو شائع شدہ مجلّہ کی ایک کاپی فراہم کی جائے گی۔
- مضامین ومقالہ نگاروں کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

زیر اہتمام: شعبہ تحقیق - جامعات المحصنات پاکستان
قیمت فی شمارہ: -/250 روپے

فہرست مضامین

ادار یہ	مدیرہ	07
مخطوطات کا تعارف واہمیت اور تاریخی پس منظر	گل ناز عبدالغفور	08
شام اور مشرق وسطیٰ کا حال اور مستقبل احادیث ﷺ کی روشنی میں	میر بابر مشتاق	21
الہامی وغیر الہامی مذاہب میں ذبیحہ کا تصور	کنیز فاطمہ	34
اقبال کا تصّور اجتہاد..... تحقیقی جائزہ	تہمینہ پرویز	47
معجزاتِ محمدِ عربی ﷺ ۔ایک جائزہ	سمیرا چشتی	66
قرآن کا سائنسی انڈیکس	انجینئر شفیع حیدر صدیقی	86

عربی مقالات

الارھاب– کلمة حق اریدَ بھا باطل	عالم خان	99
حکم حضور النسآء لصلاة الجماعة فی المسجد	الدکتورة جھان آراء لطفی	114

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

آج اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے ہر میدان میں تحقیق کی ضرورت ہے۔دینی اصولوں کو جدید دور کے مسائل پر منطبق کر کے ان مسائل کا حل تلاش کیا جانا چاہیئے ۔بلاشبہ تحقیق ایک گراں قدر اور محنت کا کام ہے نئے اور اچھوتے موضوعات پر کام کرنا، موضوعات کی چھان پھٹک جہاں تھکا دینے والے کام ہیں وہیں نہ جانے کتنے مطالعہ کرنے والوں کی ذہنی آبیاری کا سبب بنتے ہیں۔ یہ جستجو ایسی ہی ہے جیسے سمندر سے قیمتی موتی تلاش کرنا۔آج کا محقق آنے والے کل کی تعمیر کرتا ہے، بے چین روحوں کے اضطراب کو دور کر کے ایمان وآگہی کی دلیلیں فراہم کرتا ہے۔

مجلّہ المحصنات کی ٹیم کی حقیر مگر انتھک کوششوں،آپ کی دعاؤں اور سب سے بڑھ کر رب کی عطا سے چوتھا مجلّہ آپ کے علم اور ذوق ِ مطالعہ وتحقیق کی نذر ہے۔ہم اہم سے اہم تر کی طرف گامزن اللہ سے عاجزی کے ساتھ اپنی مغفرت کے طالب ہیں

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں علم سے محبت اور خوشنودی رب کے حصول میں کامیابی عطا فرمائے۔

آپ سب کے تعاون کی طلبگار

مدیرہ

ڈاکٹر عابدہ سلطانہ

نگراں شعبہ تحقیق

جامعات المحصنات پاکستان

مخطوطات کا تعارف و اہمیت اور تاریخی پس منظر

گل ناز عبدالغفور*

مخطوطہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف:

مخطوطہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ خط ہے لغوی طور پر اس سے مراد کسی بھی مادی شے پر ہاتھ سے لکھا ہوا تحریری نمونہ ہے۔ اس نمونے کی یہ تحریر نقل بھی ہوسکتی ہے اور طبع زاد بھی، طویل بھی ہوسکتی ہے، اور مختصر بھی، مفید بھی ہوسکتی ہے اور غیر مفید بھی۔ مادی اشیاء ہڈی، جھلی، کھال، جھال، پتے، کاغذ، حریر، کپڑا، دھات، لکڑی، پتھر، کانچ، سوختہ، مٹی وغیرہ غرض کوئی بھی چیز ہوسکتی ہے۔ اس صورت میں تحریری نمونے کا تعلق دیدہ زیب یا بدنما ہونے سے بھی نہیں۔ خصوصی مفہوم میں مخطوطہ کی اصطلاح قلمی کتابوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اور اس کا اطلاق بیک وقت معمولی اور شاہکار دونوں قسم کے مخطوطات پر ہوتا ہے۔(۱)

عالم اسلام میں قلمی کتابوں کے لیے مخطوطہ کی اصطلاح بالکل جدید ہے۔ مخطوطہ کے لکھنے والے کو خطاط کہتے ہیں۔ مخطوطہ کی اصطلاح اس وقت دنیائے عرب، افریقی ممالک، ترکی، جنوبی ایشیا میں مروج ہے۔ ایران، افغانستان اور وسطی ایشیاء کے ممالک میں اس کے بجائے نسخہ خطی کی اصطلاح رائج ہے۔ ایران میں اس سے قبل دست نویس کی اصطلاح رائج تھی۔ جنوبی ایشیا میں اس کے لیے قلمی یا خطی کتاب، قلمی نسخہ وغیرہ خصوصی الفاظ بھی مستعمل رہے ہیں۔ دراصل ان ساری اصطلاحوں کا اطلاق طباعت کے آغاز کے بعد مطبوعہ کے مقابلے میں ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں پر ہوتا ہے اور کتاب کی اصطلاح رائج رہی۔ اس کے لکھنے والے کو کاتب اور اس کے شجر عمل کو کتابت کے نام سے موسوم کیا گیا۔(۲)

انہی مراحل سے ابتدائے اسلام میں مخطوطہ کے لیے مسودہ کی اصطلاح بھی منظر عام پر آئی جس کا مادہ ''اسود'' (سیاہ) ہے۔ چونکہ یہ کتابیں سیاہ روشنائی سے لکھی جاتی تھیں اس لیے یہ مسودہ کہلائیں۔ اور ان کے لکھنے والے کو مسود کہا گیا۔ اسلامی

* ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی

ادب میں کتابی صورت میں مخطوطات کے علاوہ دستی تحریروں کو بالعموم دستاویزات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اور اگر کسی کتاب یا رپورٹ کا متن غیر مرتب شکل میں دستی تحریر ہو یا ٹائپ شدہ شکل میں ہوتو آج کل اسے اصطلاحاً مسودہ کہتے ہیں۔انگریزی زبان میں مخطوطہ کی متبادل اصطلاح (Manuscript) ہے۔جو دراصل لاطینی لفظ (Manuscripts) سے ماخوذ ہے۔ یہ لاطینی الاصل لفظ (Manu) اور (Scripts) دولفظوں کا مرکب ہے۔جن کے معنی علی الترتیب ہاتھ (Hand) اور لکھا (To Write) کے ہیں۔ابتداء میں یہ لفظ دو علیحدہ الفاظ کی صورت میں چلتا رہا لیکن مرور ایام کے ساتھ یہ دونوں الفاظ ایک لفظ کی صورت اختیار کر گئے۔تاریخی طور پر یہ لفظ طباعت کی ایجاد کے بعد قلمی کتب اور مسودات کے لئے استعمال ہوا تھا۔ لاطینی لٹریچر میں اس کا وجود پندرہویں صدی عیسوی سے ملنے لگتا ہے۔انگریزی لغات میں اس لفظ کے معنی ہاتھ کی تحریر، مصنف کی مطبوعہ کتاب اصل نقل، اصل ٹائپ شدہ مسودہ، ہاتھ سے لکھی ہوئی قدیم کتاب یا دستاویز وغیرہ جو کسی ملک میں طباعت کے عمومی رواج سے پہلے کی تحریر ہو یا مصنف کی قدیم کتاب کی تحریر شدہ نقل ہو۔(۳)

علم کتب خانہ کی فرہنگ اصطلاحات میں بھی Manuscript کا ترجمہ مخطوطہ ہی کیا گیا ہے۔لیکن فی زمانہ ہاتھ سے تحریر کرنے کی بجائے چونکہ ٹائپ پر اصل نسخہ کرنے کا بھی رواج ہو گیا ہے۔

اس لیے محمود الحسن مخطوطہ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ

"اصل نسخہ جو ہاتھ سے لکھا یا ٹائپ سے تیار کیا گیا ہو مخطوطہ کہ زمرے میں آئے گا" (۴)

لیکن میخائل گورمن (Michael Gorman) کی تعریف تفصیلی ہے۔

"انہوں نے ہاتھ کی تحریر، ٹائپ شدہ، پتھر اور مٹی کی تختیوں پر کندہ تحریر کو بھی مخطوطہ لکھا ہے۔تاہم پتھر اور مٹی کی تختیوں پر کندہ تحریر یا سکّوں اور ظروف پر کندہ تصویر و تحریر کا آثار و نوادر میں شمار ہے" (۵)

اس بحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قلم کے ذریعے ہاتھ سے خوش خط لکھا ہوا مبیضہ مخطوطہ ہے۔اگر اس کی نقل قلم سے کی گئی ہو تو وہ بھی مخطوطہ ہوگا۔لیکن مشینی طریقوں مثلاً فوٹو یا قلم کے ذریعے عکس لیا گیا ہو تو اسے عکسی مخطوطہ کہا جائے گا۔(۶)

مخطوطات کی اہمیت:

کوئی زبان، علم یا معاشرہ اپنے ارتقاء کی کس منزل میں ہے؟ اس کی عکاسی اور نشان دہی اس کی کتابوں اور علمی و تحقیقی کام سے ہوتی ہے۔(۷) کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں۔اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں کتابیں در

حقیقت وہ صحیفے ہیں جن میں علوم وفنون اور ان کے مختلف شعبوں کے ارتقاء کی داستانیں رقم ہیں۔معاشرہ مستقبل میں ترقی وکمال کی کن بلندیوں سے آشنا ہوگا اس کی بشارت بھی کتابوں کے اوراق ہی میں ملی ہیں۔

مسلمانوں کو اس بات پر فخر ہے اور بجا فخر ہے کہ ان کی کتاب ہدایت کا آغاز ہی تحصیل علم کی ترغیب سے ہوا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَق ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ

بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ﴿۵﴾ (۸)

جس رسولِ خدا پر یہ کتاب ہدایت اتاری گئی اس کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب وحکمت کو شامل کیا گیا ارشاد ربانی ہے:

''یُعَلِمُھُمُ الکِتَابَ والحِکمَۃَ'' (۹)

رسول عربی کو خاص طور پر یہ تلقین کی گئی:

''رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا'' (۱۰)

اور پھر خود زبان نبوت ورسالت نے اپنی امت سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلیٰ کُلِّ مُسْلِمٍ'' (۱۱)

ان محرکات کا لازمی نتیجہ تھا کہ اس دین کے ماننے والوں کا طرہ امتیاز تحصیل علم اور اشاعت علم ہو اور ایسا ہی ہوا۔مسلمانوں کی یہی سوچ آگے چل کہ پوری دنیا کیلئے علم کے راستے بناتی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے عرب جو جہالت کی لپیٹ میں بری طرح غرق تھا علم کے نور سے تمام عالم پر چھا گیا۔

اسلامی تمدن کی بنیاد لفظ اور کتاب پر ہے قلمی نسخے یا مخطوطات ہاتھ سے لکھے گئے تھے۔اس کے ذریعے قرآن کی حفاظت کی گئی ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ حفاظِ کرام اور کاتبوں نے قرآن حکیم کے اصل متن کو محفوظ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔قرآن حکیم کے محفوظ کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب علم ہے۔جس سے ہم ماضی کی تاریخ، ادب اور علم وفن سے آشنا ہوئے اور اسی طرح ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔تاریخی ورثے کی اہمیت وافادیت ہر دور میں رہی ہے۔ان نادر ونایاب اشیاء میں قدیم عمارات، مطبوعات، خطی نسخے، سرکاری مراسلہ جات، خطوط، علمی اور قلمی نسخہ جات ہر لحاظ سے اہمیت کے حامل رہے ہیں۔قلمی مخطوطات ہمارے بزرگان کی ایسی گم شدہ میراث ہے جیسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور ان کی

حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔

اسلام کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ مسلمانوں نے کتاب شناسی اور کتاب داری کو اس قدر پروان چڑھایا کہ قرون اولیٰ میں مسلمانوں کا کوئی گھر ایسا نہیں ملتا تھا جس میں کتاب اور کتب خانے کا وجود نہ ہو۔قرآن کریم کی کتابت جہاں عمل میں آرہی تھی اور کاتبینِ وحی موجود تھے وہیں آپ ﷺ کی احادیث بھی بعض صحابہ رضی اللہ عنہم لکھ لیا کرتے تھے۔جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ،عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ،حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اس حوالے سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔

پہلی، دوسری اور تیسری صدی اسلامی دنیا میں اس حوالے سے خاص اہمیت کی حامل ہیں کہ اس دور میں حدیثِ نبوی ﷺ کی تدوین ہوئی۔اس وقت تمام علوم وفنون پر قلمی کتابیں مخطوطات کی شکل میں تھیں اس دور میں اشاعتی ادارے موجود نہیں تھے لہذا قلمی کتابوں کو وجود بنایا گیا۔اس دور میں یا تو مصنف خود کوئی کتاب مرتب کرتا تھا یا اپنے اکابر علماء وشاگردوں کے ذریعہ املا کرواکے کتابیں شائع کرتے تھے اس کے بعد علمی دنیا میں کتابوں کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔

مسلم دنیا میں کم وبیش ہر شہر وقریہ میں کتب خانے کا وجود تھا۔سقوط بغداد اور عباسی مملکت کا زوال اسلامی دنیا میں علمی ورثے کی تباہی کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔تاتاریوں نے مسلمانوں کے علمی وتہذیبی مراکز کو تباہ وبرباد کردیا اور تمام بنیادی کتابیں برباد کرڈالیں۔اس کے باوجود اسلامی دنیا میں کم وبیش ہر کتاب کا حوالہ ونسخہ موجود ہے گو کہ بے شمار ایسی کتابیں بھی اس تباہ کن معرکہ میں ضائع ہوئیں جن کا نام ملتا ہے لیکن وجود نہیں۔

انہی علمی خزانوں سے مخطوطات کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ مخطوطات انسان کے تہذیبی کارناموں کا عظیم ورثہ ہیں۔یہ انسان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ذہنی، فکری، جذباتی اور نفسیاتی حالات کے ترجمان ہوتے ہیں۔یہ اس فضا اور ماحول کو پیش کرتے ہیں جن میں وہ تخلیق ہوئے۔اور انسانی معاشرہ کی روایات واقدار کے امین ہوتے ہیں۔جس سے آئندہ نسلیں رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔یہ ماضی کے یادگار واقعات وحالات کا ریکارڈ ہوتے ہیں۔جس کے مطالعے سے انسان میں مستقبل سے نمٹنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔اس سے آئندہ نسلوں کے افراد اور ابھرنے والی اقوام درس عبرت حاصل کرتی ہیں۔مخطوطات، حکام، امراء اور عوام کی علمی دوستی اور ان کے تعلیمی نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں۔اسلام میں مخطوطات کی تخلیق، انکی حفاظت اور آئندہ نسلوں تک منتقلی ایسے اسلامی شعائر ہیں جن کی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔مخطوطات کے بارے میں اہم

بات یہ بھی ہے کہ یہ افراد اور اقوام کے مذہبی رجحان اور عقیدے کے مظہر ہوتے ہیں۔(۱۲) یہ کہنا بجا ہے کہ مخطوطات انسانی تہذیب کا سب سے قیمتی ورثہ ہے۔ یہ انسانی روایات واقدار کو نسل در نسل منتقل کرتے ہیں اور انسانی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کی تاریخ آگے بڑھانے میں مدومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ اگر مخطوطات نہ ہوتے تو ہر نسل انسانی کو زندگی کا آغاز از سرنو کرنا پڑتا اور اس طرح تہذیبی عدم تسلسل کی وجہ سے انسان تہذیب وترقی کے منازل طے کرنے میں دشواری محسوس کرتا۔(۱۳)

مخطوطات کی تاریخ:

باقاعدہ طور پر لکھائی کی ابتدا کب سے ہوئی اور کیسے ہوئی اسکا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ پر یہ حقیقت ہے کہ انسان کی پہلی تحریر بڑی سادہ تھی وہ اپنا مطلب سمجھانے کے لیے لکیریں اور تصویروں کے اشارے سے کام لیتے تھے۔ فونیقیوں نے عالم انسانیت کو ابجد کی نعمت عطا کی وہ پہلی قوم تھی جنہوں نے خالص ابجدی اور بڑا منظّم سلسلہ تحریر وکتابت استعمال کیا اور اسے دنیا بھر میں پھیلایا۔(۱۴)

جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو انسان کو اپنے اردگرد جو چیز بھی میسر آتی رہی اس نے ان چیزوں سے تحریر کا کام لیا۔ مثلاً اہل چین کاغذ کی ایجاد سے پہلے کپڑوں پر لکھائی کیا کرتے تھے۔ اہل مصر بھی کپڑوں پر لکھتے رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے درختوں کی چھال یا جانوروں کی کھال پر بھی لکھائی کی چھال پر لکھنا بہت مشکل کام تھا اور پھر چھال کو موسم کی شدت سے محفوظ رکھنا بھی دشوار تھا کیوں کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد خشک ہو کر خراب ہو جاتی تھی۔(۱۵)

تقریبا چار ہزار سال پہلے اہل مصر نے کاغذ سے ملتی جلتی چیز جیسے پیپرس کہتیہیں لکھائی کیلئے استعمال کیا دراصل پیپرس ایک پودے کا نام تھا۔ جو اس زمانے میں دریائے نیل کے کناروں پر کثرت سے اُگتا تھا۔ اسی درخت کی چھال سے کاغذ جیسی چیز بنا کر کتابوں کی اشکال دے دی جاتی تھی اور لوگ اپنی ضروری باتیں اس پر تحریر کرتے تھے۔(۱۶) عربوں نے تیسری صدی عیسوی میں نبطی رسم الخط اختیار کر لیا تھا۔ ڈیڑھ دو سال بعد اس میں تبدیلی کر کے بڑی حد تک انفرادیت پیدا کر لی چونکہ اسلام میں جانداروں کی تصویریں بنانا ممنوع ہے اس لئے مسلمانوں نے اپنے ذوق مصوری کو حروف کی آرائش وزینت میں صرف کیا۔(۱۷)

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عرب میں کوفی خط رائج تھا چنانچہ آپ ﷺ نے بادشاہوں اور سرداروں کے نام جو تبلیغی خطوط روانہ فرمائے وہ کوفی خط میں تحریر کئے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ خود اُمی تھے، مگر آپ ﷺ نے مسلمانوں میں علم

پھیلانے کی عملی کوشش فرمائی جو اسیران جنگ بدر فدیہ ادا نہیں کر سکے تھے انہیں حکم دیا گیا کہ وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔آنحضرت ﷺ کے وصال سے کچھ عرصہ پیشتر چالیس کاتبانِ وحی موجود تھے۔(۱۸)

جلد (چمڑے) پر موجود مخطوطات کی تاریخ:

مشرق قریب چمڑے (جلد) پر لکھنے کا استعمال بہت معروف تھا مصر میں اس سے قبل سلطنت وسطی میں بھی یہ مستعمل تھا۔جنوب مصر میں میریو Meroe اور نوبیہ Nubia کی سلطنت میں چمڑے پر لکھے ہوئے مخطوطات ملے ہیں۔فلسطین اور ایران کے آخر الذکر ملک میں شاہی دفاتر (Archives) چمڑے کی دستاویزات پر مشتمل تھے۔ساتویں صدی عیسوی میں ایران نے مصر سے فتح حاصل کر لی تھی تو اس وقت بھی وہاں چمڑے پر لکھا جاتا تھا۔ ۱۰۱۰ء کے بعد جب ایرانی جنوبی عرب پہنچے انہوں نے وہاں چمڑے کی صنعت کی حوصلہ افزائی کی۔یمن پر ایرانیوں کے تسلط سے پہلے بھی یہاں چمڑا تحریر کے کام آتا رہا چنانچہ ایک حمیری بادشاہ کا تمسک رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب بن ہاشم کے نام جو خلیفہ المامون کے خزانے میں محفوظ کر لیا گیا تھا چمڑے کے ایک ٹکڑے پر تھا۔(۱۹)

گویا معلوم ہوا چمڑے پر تحریر کا کام اسلام سے پہلے کیا گیا عربوں کو اپنے حافظے پر بڑا فخر تھا۔ان کا حافظہ بہت قوی تھا وہ جس محفل میں بیٹھتے وہاں کی ایک ایک بات حفظ کر لیتے انہوں نے اسلام سے پہلے ہی تحریر کا کام کیا اس وقت انہوں نے کوفہ میں کھالوں کی دباغت کا طریقہ ایجاد کر لیا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مذکور ہے کہ چمڑے کو لکھنے کیلئے استعمال کریں۔اس کی مثال ہمیں کنوؤں اور زمینوں کے ھبہ نامے اور وحی کے بعض حصوں پر لکھنے سے معلوم ہوئے اس کے ساتھ ساتھ حضرت علیؓ نے بھی آپ ﷺ کی پیروی کی۔ایک خاص چیز قابل ذکر ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ سے قرآن پاک کا ایک نسخہ منسوب ہے جو شتر مرغ کی کھال پر تحریر کیا گیا تھا۔اور مدینہ منورہ میں عارف (کتب خانہ) میں محفوظ ہے۔(۲۰)

قاہرہ (مصر) قومی کتب خانے میں ۱۰۰ھ اور ۲۳۳ھ کے قدیم چرم کے مخطوطات محفوظ ہیں۔برلن کے سرکاری عجائب خانے میں موجود قرآن مجید کے مخطوطات جو ہرن کی کھال پر تحریر تھے البیرونی اپنی ''تاریخ ہند تحقیق ماللھند'' میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

مقدس کتابوں کی تحریر کیلئے ورق کا استعمال کیا جاتا تھا۔یہودیوں کے یہاں ورق پر تحریر رائج تھا توریت کی کتابت

بھی ورق پر کی گئی تھی۔اس کے ساتھ کتابت وحی کے لیے ورق کا استعمال ہوااور اس کے پارچے رسول اللہ ﷺ کے ترکے میں بھی پائے گئے۔آنحضرت ﷺ نے مختلف مواقع پر ورق کا استعمال کیا ہے۔ اورق،قرطاس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے۔ اموی دور میں اوراق بردی کو تحریر کے کاموں میں لایا جاتا تھا۔شمالی افریقہ کی ''القید وان مسجد سدی عقبہ]] کے خزانے میں سے رِق کے سینکڑوں ادبی مخطوطات ملے ہیں۔عراق کے دفاتر میں زیادہ تر رِق ہی کا استعمال رہا حتیٰ کہ الفضل یحیٰی بن خالد البرمکی نے اس کی جگہ کاغذ کا استعمال کیا۔ ہرن کی کھال کا ایک خاص قیمتی ورق بنتا تھا جو بہت بیش قیمت ہوتا تھا۔مصر کے کتب خانوں میں ہرن کی کھال کے کاغذ پر کلام اللہ کے بہت سے نسخے موجود ہیں۔(۲۱) یہاں قدیم رق کا بھی پتہ چلا ہے یہ ایک خاص قسم کا ورق اودے رنگ کا ہوتا تھا جس کے بارے میں قرون وسطی کے ابتدائی دور کے لاطینی مخطوطات کا پتہ چلا ہے۔ایک مخطوطہ جو خط کوفی پر لکھا گیا ہے۔جو مشہد (ایران) کی مسجد کے مخطوطہ قرآن کا ایک حصہ ہے۔ (۲۲)

عیسائی مؤرخ جرجی زیدان کے قول کے مطابق:

''مسلمانوں نے اس وقت کے تمام علوم وفنون،فلسفہ،طب،نجوم،ریاضی،ادب،تاریخ وغیرہ کو جو تمام عالم میں رائج تھے ایسی زبان میں منتقل کرلیا تھا۔انہوں نے یہ تمام ذخیرہ صرف ڈیڑھ صدی میں جمع کرلیا تھا۔اور اہل روم پوری چار صدیوں تک یونانی علوم کو نقل نہ کرسکے تھے۔ یہ مسلمانوں کی عجیب وغریب خصوصیت ہے جو دنیا کی کسی دوسری قوم میں نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے تمدن کے تمام اسباب حیرت انگیز عجلت کے ساتھ مہیا کر لئے۔''(۲۳)

اسلام میں بنی امیہ کے دورِ خلافت میں خالد بن یزید بن امیر معاویہ رضی اللہ عنہ (متوفیٰ: ۸۵ھ) کو نادر کتابوں کے جمع کرنے اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے تراجم کرکے اپنے سرکاری محافظ خانہ میں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔اس کے بعد عبد الملک بن مروان کے عہد میں شاہی دستاویزی مراکز قیمتی نوادر اور بیش بہا مخطوطات کی وجہ سے کافی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱ھ- ۹۹ھ) کے عہد خلافت میں تصنیف وتالیف اور علمی سرگرمیوں کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔(۲۴) ابو جعفر منصور (۱۵۱-۱۲۶ھ) نے بغداد کی بنیاد ڈالی اور اس کو دارالحکومت قرار دیا تو بغداد علوم وفنون کا مرکز بن گیا۔ ہارون الرشید (۱۹۳- ۱۷۰ھ) نے بغداد میں بیت الحکمت جس کو ہم سرکاری محافظ خانہ کہہ سکتے ہیں قائم کیا۔ یہاں سرکاری دستاویزات اور امسال کے ساتھ ساتھ قیمتی مخطوطات کا بڑا ذخیرہ بھی محفوظ کیا گیا تھا۔اس علمی ادارہ میں رات دن محققین اور شائقین مطالعہ کی بڑی تعداد تحقیق ومطالعہ میں مصروف دکھائی دیتی تھی اس ادارے کو مامون رشید نے مزید وسعت دی مامون

نے کتب خانہ میں عرب دور جاہلیت کے قصائد، خطوط، دستاویزات کا بڑا وسیع ذخیرہ جمع کیا تھا۔اس ذخیرہ میں ایک دستاویز ایسی عجیب وغریب اور نادر تھی جو حضرت عبدالمطلب بن ہاشم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی یہ کتب خانہ دس لاکھ مخطوطات پر مشتمل تھا۔(۲۵) بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے بغداد، کوفہ، بصرہ، دمشق، قاہرہ، قرطبہ، بخارا، ہرات اور پھر برصغیر میں دہلی،لکھنؤ، حیدرآباد، پٹنہ، رامپور، بھوپال، لاہور، ملتان اور ٹھٹھ اسلامی کتابوں کے بڑے مراکز بن گئے۔

ابتدائی صدیوں میں صورت حال آج سے بہت مختلف تھی۔ اب تو طباعت اتنی عام ہوگئی کہ جلد ہی کتابیں طبع ہوجاتی ہےاور پھراس کے ضائع ہونے کا امکان ختم ہوجاتا ہےلیکن اسلامی عہد کے ابتدائی دور میں بلکہ صدیوں تک طباعت کی کوئی صورت نہ تھی کتابیں مسودات کی صورت میں محفوظ رہتی تھیں۔اس وقت کسی کتاب کے ایک یا دو یا زیادہ سے زیادہ چند مخطوطے ہوتے تھے یہ کہنا کہ فلاں کتب خانے میں بیس ہزار کتابیں تھیں آج کے دور میں یہ کہہ دینے کے مترادف ہے کہ فلاں کتب خانے میں دولاکھ کتابیں ہیں۔تصنیف وتالیف اور تعلیم وتعلم کے میدان میں دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکی اوراس دعوے میں مبالغہ کی کوئی آمیزش نہیں ہے۔مسلمانوں کی ابتدائی صدیوں میں کتابیں صرف مخطوطات کی شکل میں ہوتی تھیں ایک مخطوطہ کا ضائع ہوجانا پوری کتاب اورتصنیف کا ضائع ہوجانا تھا۔یہی وجہ ہے کہ جو غیرمسلم قومیں مسلمانوں پر غالب آئیں اور مسلمان حکومتوں اور علاقوں کو فتح کیا انہوں نے مسلمانوں کی دوسری املاک کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا ان کے کتب خانوں کو پہنچایا۔انہوں نے کتابوں کوانسانوں سے بھی زیادہ اہم سمجھا۔آبادیوں کا قتل عام بعد میں کیا پہلے اسلامی کتب خانے لوٹے اوران میں موجود قیمتی مسودات کو جومختلف علوم وفنون پر مشتمل تھے جلایایا دریا بُرد کیا۔وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کونقصان پہنچانے کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے کہ انہیں ان کی علمی اور ثقافتی میراث سے محروم کردیا جائے۔پچھلی نسل نے علم اورفن کے میدان میں جوگرانقدر کام کیا ہے وہ آنے والی نسل تک نہ پہنچے۔

مسلمانوں نے ابتدائی صدیوں میں جب مغرب جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا۔ دینی علوم کے علاوہ دوسرے علوم پر بھی اتنا تصنیفی کام کیا کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکی۔ بنوعباس کے ابتدائی دور میں بیت الحکمت کے نام سے جو کتب خانہ قائم کیا اس میں کتابوں کی تعداد دس لاکھ تھی اس وقت دس لاکھ کتابوں کا مطلب دس لاکھ مخطوطے ہیں۔(۲۶)

طباعت اورنشر واشاعت کے ذرائع ومسائل میں غیر معمولی ترقی سے جہاں بہت سے فوائد ہوئے وہی اہل علم کی تصانیف اور علمی کاوشیں ضائع ہونے سے بچ گئیں وہاں ایک نقصان بھی ہوا کہ مسودات اور مخطوطات کی اہمیت کم ہوگئی۔مسودات ومخطوطات کو جواہلِ علم ترمیم کرتے ہیں ان کو زیادہ دشواری اس بناء پر پیش آتی ہے کہ مسودہ مصنف کا لکھا ہوا نہیں ہوتا۔اس کے نقال دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ایک ہی کتاب کے ایک سے زائد نسخے ہونے کی صورت میں ان کے درمیان تقابل اور موازنہ ضروری ہوجاتا ہے وہاں مدیر ومحقق صرف اتنی وضاحت کرتا ہے کہ فلاں نسخے میں فلاں عبارت اس طرح پائی گئی اورفلاں نسخے میں اسطرح لیکن ان کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ہوتی جس کی بناء پر وہ کہہ سکے کہ فلاں عبارت حتمی طور پر مصنف کی ہے اور فلاں عبارت تحریف شدہ ہے۔مثلا: امام مالک بن انس رحمہ اللہ تعالی (متوفی: ۱۷۹ھ) کا مرتب کردہ مجموعہ احادیث جس میں ان کی فقہی آراء اوراجتہادات بھی ہیں ان کے شاگردوں کا لکھا ہوا ہے۔اس کے سولہ نسخے معروف و متداول ہوئے لیکن ان میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔(۲۷)

مسلم ممالک میں مخطوطات کی تحقیق:

اسلام کی چودہ صد سالہ تاریخ میں مخطوطات کی تحقیق کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ان مخطوطات نے ہی مسلم ممالک میں تحقیقات کوفروغ دیا۔آج ہمیں ایک ایک کتاب کے بیشمار نسخے ملتے ہیں۔ بلکہ ان مخطوطات کی فہارس تک کئی کئی جلدوں میں موجود ہیں۔مسلم دنیا کا یہ ورثہ مسلمانوں کی علمی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔پرنٹنگ پریس کے وجود میں آنے کے بعد ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ ان نادر کتابوں کو از سر نو شائع کیا جائے۔ یہ ابتدائی مرحلہ تھا اس کے بعد جب ایک کتاب کے مختلف نسخوں کی عبارات میں اختلاف آیا تو مخطوطات سے تقابلے کی ضرورت محسوس ہوئی۔آج اسالیب تحقیق میں اسے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ عرب ملکوں سے جتنی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی باقاعدہ ایڈیٹنگ ہوتی ہے۔

چنانچہ آج مسلم دنیا میں اور غیر مسلم دنیا میں مخطوطات کو اس لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کہ اس کے ذریعے مقالہ نگار یعنی وہ شخص جو کسی مخطوطے کو ترمیم کرتا ہے اوراس پر تحقیق کرتا ہے وہ بیک وقت کئی تحقیقی مراحل سے گزرتا ہے وہ اس قلمی نسخے کی اہمیت،اس کے موضوع،اس کے مصنف،خود مصنف کے حالات زندگی اور کتاب کے تعارف وخصوصیات کا لحاظ کرتا ہے۔ وہ مقدمۃ الکتاب میں نفس مصدر (اصل کتاب) اس کے مؤلف کے حالات،اس کے اساتذہ،تلامذہ، تصانیف اور خدمات کا بڑی حد تک لحاظ کرتا ہے۔پھر کتاب کے متن پر تحقیق کے دوران اگر کوئی حدیث آتی ہے تو اس کی تخریج

کرتا ہے۔کوئی آیت آتی ہے تو اس کا حوالہ دیتا ہے۔ گویا وہ اسے انساب و بلدان اور جغرافیہ سے متعلق موضوعات اور دیگر اہم کتب سے مراجعت کے بعد تحقیق کرتا ہے مثلاً اگر وہ کہیں امام طحاوی کا ذکر کرتا ہے تو امام طحاوی کا نام، ولدیت، کنیت، نسبت، اس کے آبائی شہر کا ذکر لازماً پائے گا۔ وہ تحقیق کے دوران ان سب امور کا لحاظ کرتا ہے۔مثلاً امام طحاویؒ کا نام احمد بن محمد بن سلمی بن سلامہ الطحاوی الحجری المصری ہے۔تو مقالہ نگار یہ سب ذکر کرے گا وہ اس دوران کہیں اگر ان کے نام، باپ یا دادا کے نام، کنیت یا نسبت میں کوئی اختلاف پائے گا تو اس کی وضاحت بھی کرے گا۔اس میں سب سے پہلی چیز یہ ہوتی ہے جس شخص کا نام آتا ہے اس کے حالات زندگی جن اہم کتابوں میں موجود ہوتے ہیں وہ ان کتابوں کا اور ان کے مراجع کا مکمل طور پر ذکر کرتا ہے۔

تحقیق کے سلسلے میں علامہ ذہبیؒ کی کتاب ''سیر اعلام النبلاء'' ایک بہترین مثال ہے۔آج محدثین، فقہاء اور ہر طبقہ زندگی سے وابستہ علماء کے حالات عمومی طور پر اعلام النبلاء میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک جامع کتاب ہے۔جس میں ساتویں صدی ہجری تک کے رجال کا تذکرہ موجود ہے۔کتاب کا حوالہ دیتے وقت یا تو نفس مصدر یعنی کتاب کو پہلے لاتے ہیں یا مصنف کو پھر مقام اشاعت، ادارہ ومکتبہ جہاں سے وہ کتاب شائع ہوئی اس کے بعد سن اشاعت اور آخر میں جلد و صفحہ۔

اسی طرح جب جغرافیہ اور انساب کا معاملہ ہوگا تو اس سے متعلق کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔انساب کے حوالے سے صنعائی کی ''کتاب الانساب''، سیوطی کی ''اللباب فی تحریر الانساب''، اسی طرح مسلم دنیا کے جغرافیہ کے بارے میں بھی متعدد کتابیں تذکرہ نگاروں نے لکھی ہیں۔جن میں علامہ یعقوت حموی کی کتاب ''معجم البلدان'' کو اہم مصدر کے طور پر جانا جاتا ہے۔اور ان کے حوالے دیے جاتے ہیں۔اسی طرح اگر معاملہ لغت کا اور زبان وادب کا ہو تو اس سے متعلق کتب کی طرف مراجعت کی جاتی ہے۔اور اصل کتاب تک پہنچ کر اس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔مثلاً ابن قدامہ کی ''المغنی'' (اصول الفقہ) وغیرہ۔ اگر متن اور اصل ماخذ کی عبارت میں اختلاف ہو تو اس کو بھی ذکر کیا جاتا ہے۔اگر مصنف کا تسامح ہو تو وہاں بھی دیگر کتب سے مراجعت کے بعد مختصر نوٹ تحریر کیا جاتا ہے۔غرض قلمی کتاب یا مخطوطہ ایڈٹ کرنے کے دوران ایسے بہت سے امور کو لازمی طور پر پیش نظر رکھا جاتا ہے۔یہ کام بیک وقت تحقیق، تعلیق، تدوین اور تخریج بھی کہلاتا ہے۔

عرب دنیا میں دکتورہ (Ph.D) کے بیشتر موضوعات کا تعلق مخطوطات سے ہی ہوتا ہے۔وہ کسی قلمی کتاب کو موضوع بنا کر ایڈٹ کرتے ہیں اسے ''رسالۃ الدکتورہ'' کہا جاتا ہے۔اسی طرح دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی انگریزی، عربی یا دیگر زبانوں میں جو تحقیقی کام کیا جاتا ہے اس میں قلمی کتاب کو تحقیق کے لیے بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ

مستشرقین نے بھی اس حوالے سے اسلامی موضوعات پر بہت سی کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے اس فہرست میں مستشرقین کے نامور لوگوں کے نام شامل ہیں۔ ابن سعد کی الطبقات الکبری جو ایک بنیادی مصدر و مراجع ہے اسے آغاز میں مستشرقین نے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ اسی طرح ابن خلدون کی تاریخ اور مقدمہ کو پہلے پہل مستشرقین نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔

اسی طرح بے شمار کتابیں ہیں جنہیں بنیاد بنا کر تحقیق کی گئی۔ الوافی بالوفیات (خلیل بن ایبک الصفدی) جو کہ رجال پر کتاب کو بھی مستشرقین کی ایک جماعت نے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ مسلم دنیا کے بڑے بڑے نامور کتب خانے اس حوالے سے خاص شہرت رکھتے ہیں وہاں مخطوطات کے بڑے بڑے ذخائر ہیں۔ ان کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی فہرستیں ہی کئی کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ایسی بہت سی کتابیں جو ایڈٹ ہو کر عرب دنیا سے شائع ہوئی ہیں ایک مستشرق سرگیس نے ایسی کتابوں کی ایک جامع فہرست مرتب کی ہے جس کا نام ''معجم المطبوعات العربیۃ المعربۃ'' ہے یہ کتاب کئی جلدوں میں ہے۔ اسی طرح ایک کتاب ''ذخائر التراث العربی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ جس میں بے شمار ایسی عربی کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے جن پر محققین نے کام کیا ہے اور انہیں ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔

حرف آخر:

انسانی روایات واقدار کو نسل در نسل منتقل کرنے میں مخطوطات کا ہی سہارا لیا گیا ہے۔ مخطوطات انسانی تہذیب کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ انسان کے ماضی کو اجاگر کرتا ہے۔ مخطوطات کسی بھی قوم کی تاریخ کا ترجمان ہوتی ہیں۔ یہ ہمارے مستقبل کو روشن کرتی ہے اور ماضی میں ہونے والے غلط فیصلوں کے نتائج کی نشان دہی کرتی ہیں یہ انسانی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کی تاریخ کو آگے بڑھانے میں مدد ومعاون ثابت ہوتے ہیں اگر مخطوطات نہ ہوتے تو ہر نسل کو اپنی زندگی کا آغاز از سر نو کرنا پڑتا انہیں اپنے بزرگوں کے کارناموں، تہذیب وثقافت علمی صلاحیتوں کا پتہ لگانے میں مشکل پیش آتی۔ تہذیبی عدم تسلسل کی وجہ سے انسان تہذیب وترقی کے منازل طے کرنے میں دشواری محسوس کرتا۔ امتِ محمدی ﷺ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس دین کی بنیاد ہی لوح وقلم سے شروع ہوئی۔ قیامت تک رہنے والا دینِ اسلام علم کے ذریعے پھیلا اور یہ علم باقاعدہ طور پر نسل در نسل لکھا گیا اور اسے محفوظ کیا گیا۔ یہ ہمارے پاس مخطوطات کی شکل میں پہنچے علمی مخطوطات ہمارے ماضی کی پہچان ہے کہ اس دین نے کتاب کے ذریعے دنیا کو راہ راست دکھائی۔ ان مخطوطات سے ہمیں اپنے بزرگوں کی علمی جستجو کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے مشکل حالات میں رہ کر ان چیزوں کو ہم تک مضبوط طریقوں سے پہنچایا۔۔ یہ مخطوطات ہمارے میراث گم گشتہ، متاع عہد رفتہ، سرمایہ تاریخ، دولت بے بہا اور علمی اداروں کی طرف سے نگاہ التفات کے منتظر ہیں۔

مراجع وحواشی:

۱۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر مخطوطات (اہمیت، حصول، تحفظ) فکرونظم: مخطوطات ۔خصوص اشاعت، شمارہ ۲،۳ ، تحقیقات اسلامی پریس، اسلام آباد، ۱۹۹۸۔۱۹۹۷ء

۲۔ ایضاً، ص:۳۳

۳۔ ایضاً، ص:۳۴

۴۔ نسیم فاطمہ، اردو مخطوطات کی کیٹلاگ سازی اور مصیار بندی، لائبریری پروموشن بیورو، ۲۰۰۰، ص : ۲

۵۔ ایضاً، ص : ۲

۶۔ ایضاً، ص : ۲

۷۔ محمد میاں صدیقی، ڈاکٹر، فکرونظر: مخطوطات ۔خصوصی اشعار، شمارہ:۲،۳، تحقیقات اسلامی پریس، اسلام آباد، ۱۹۹۸- ۱۹۹۷

۸۔ سورۃ العلق : ۵-۱

۹۔ سورۃ البقرہ : ۱۲۹

۱۰۔ سورۃ طٰہٰ : ۱۱۴

۱۱۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، حدیث نمبر ۲۲۴، تحقیق فواد عبد الباقی

۱۲۔ انجم رحمانی، مخطوطات (اہمیت، حصول، تحفظ) فکرونظم: مخطوطات ۔خصوصی اشاعت، شمارہ ۲،۳ ، تحقیقات اسلامی پریس، اسلام آباد، ۱۹۹۸-۱۹۹۷، ص: ۳۲۔۳۱

۱۳۔ ایضاً، ص:۳۳

۱۴۔ الطاف شوکت، نظام کتب خانہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشر، ۱۹۷۸، ص : ۸۳—۸۱

۱۵۔ ایضاً، ص:۹۱

۱۶۔ ایضاً، ص:۹۳

۱۷۔ ایضاً، ص:۸۷

۱۸۔ ایضاً، ص:۸۷

۱۹۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ج ۷، ص:۲۴۴

۲۰۔ ایضاً، ص:۳۴۵

۲۱۔ ایضاً، ص:۳۴۵

۲۲۔ ایضاً، ص:۳۴۶

۲۳۔ اشرف علی، تحفظ دستاویزات و کتب خانہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص :۲۶

۲۴۔ ایضاً، ص:۲۷

۲۵۔ ایضاً، ص:۲۷

۲۶۔ محمد میاں صدیقی، ڈاکٹر، فکر و نظر: مخطوطات خصوصی اشعار، شمارہ: ۲، ۳، تحقیقات اسلامی پریس، اسلام آباد. ۱۹۹۸-۱۹۹۷

۲۷۔ ایضاً، ص:۲۹

شام اور مشرق وسطیٰ کا حال اور مستقبل

احادیث ﷺ کی روشنی میں

میر بابر مشتاق*

ابراہیم خلیل اللہ کا دار الہجرت، انبیاء بنی اسرائیل کا مولد و مسکن اور تین عظیم اہل کتاب امتوں کا روحانی مرکز شام، ابتدائی ادوار تاریخ سے تہذیبوں کے بننے اور مٹنے میں اپنا کردار ادا کرتا رہا ہے۔اس سرزمین نے ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام کے دلنشین وعظ بھی سنے اور یعقوب و داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے بادشاہوں کی ہیبت و جبروت کے وارفتہ مناظر بھی دیکھے۔ یہ کتنی تعجب خیز بات ہے کہ آنحضرت ﷺ کا زمینی سفر تو کعبہ مکرمہ سے شروع ہوا اور آسمانی سفر کا نقطہ آغاز بیت المقدس بنا۔ابو عبیدہؓ بن الجراح ، خالدؓ بن ولید ،عکرمہؓ بن ابی جہل ،شرحبیلؓ بن حسنہ اور یزید بن ابی سفیانؓ کی پُرعظمت داستانوں کی امین اس سرزمین نے عدل فاروقیؓ کے تاریخ ساز مناظر بھی دیکھے اور مظالم یزید و مروان سے تلخ کلام بھی رہی۔

اہل شام کی تلخ یادداشتوں میں آتش و آہن سے کھیلتے ،موت و فساد کے ہنگامے برپا کرتے اور چہار سو بربادیوں کے نشان چھوڑتے صلیبی جنگجوؤں کی خونخواریاں آج بھی نفرت و انتقام کی بھٹی روشن کر دیتی ہیں۔نورالدین زنگیؒ ،صلاح الدین ایوبیؒ ،رکن الدین بیبرسؒ اور ابن طولون کا شام آج پھر تیسری اور شاید آخری بار صلیب و ہلال کی معرکہ آرائیوں کا میدان بننے والا ہے۔ (۱)

اہل یورپ نے اپنی فساد انگیز سیاست کو کامیاب بنانے کے لیے اس عظیم تاریخی ملک کے پانچ ٹکڑے کر دیے ہیں۔ اس کے ایک کنارے میں فلسطین کی وہ بابرکت بستی آباد ہے جس نے تین بڑی امتوں کا قبلہ اپنے سر میں تاج کی طرح پہن رکھا ہے۔اس کے ساحلوں کی سرزمین لبنان اور دریائے یردن کے دامن کا علاقہ مملکت اردن قرار دے کر اس سے الگ کر لیا گیا ہے۔اس طرح شام کی سرزمین جس کا تذکرہ قرآن و حدیث میں متعدد بار آیا ہے، سازشوں کے نتیجہ میں آج پانچ مختلف ملکوں

---

* ریسرچ اسکالر، لاہور

میں منقسم ہے یعنی شام، اردن، فلسطین، لبنان اور اسرائیل۔

شام کی فضیلت قرآنی آیات میں:

متعدد قرآنی آیات میں سرزمینِ شام کی جس میں فلسطین اور بیت المقدس بھی شامل ہیں، فضیلت بیان کی گئی ہے۔

۱۔ارشاد باری تعالی ہے:

وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ O وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ(الانبياء : ۲۱. ۷۰. ۷۱)

''گوانہوں نے ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ مکر کا ارادہ کیا لیکن ہم نے انہیں ناکام بنادیا اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کو نجات دے کر اس سرزمین پر پہنچادیا جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لیے برکت رکھی تھی۔''

امام ابن جریر الطبری رحمتہ اللہ اس بابرکت سرزمین کے متعلق کہتے ہیں:

''اس بابرکت سرزمین سے مراد شام کی سرزمین ہے، اور ہم نے اس کی یہ تفسیر اس لیے کی ہے کہ تمام اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے شام ہی کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے جہاں آپ نے زندگی کے باقی ایام گزار دیے۔ ہاں! آپ مکہ ضرور گئے اور وہاں بیت اللہ بھی تعمیر کیا، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی ان کی ماں ہاجرہؑ کے ہمراہ وہاں ٹھہرایا لیکن خود وہاں نہیں ٹھہرے، اور نہ ہی اسے اپنے لیے اور حضرت لوط علیہ السلام کے لیے وطن بنایا۔''(۲)

حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں:

''ان آیات میں اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق خبر دی ہے کہ اللہ نے انہیں ان کی قوم کی تیار کردہ آگ سے نجات دی اور وہ ہجرت کر کے ملک شام کی مقدس سرزمین کی طرف چلے گئے۔''(۳)

اور علامہ عبدالرحمٰن السعدیؒ کہتے ہیں۔

''اس بابرکت سرزمین سے مراد سرزمین شام ہے۔ اور اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اسی سرزمین پر بہت سارے انبیاء کو مبعوث فرمایا اور دوسری یہ کہ اسی سرزمین کو ابراہیم علیہ السلام کی جائے ہجرت کے لیے منتخب فرمایا اور تیسری یہ کہ اسی سرزمین پر اللہ کے تین مقدس گھروں میں سے ایک گھر واقع ہے اور وہ بیت المقدس ہے۔'' (۴)

۲ .وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا

''ہم نے تند و تیز ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا جو ان کے فرمان کے مطابق اس زمین کی طرف چلتی تھی جہاں ہم نے برکت دے رکھی تھی۔'' (۴۷۴ ابنیاء:۸۱/۲۱)

امام ابن جریر الطبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اللہ رب العزت فرماتے ہیں: حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم پر بابرکت سرزمین یعنی شام کی طرف چلتی تھی، اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو، جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے، لے جاتی تھی، اور پھر انہیں ان کے گھر شام میں واپس لے آتی تھی۔'' (تفسیر الطبری ۵۵/۱۰)

۳. **يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ** (المائدہ : ۵ : ۲۱)

''اے میری قوم! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے نام لکھ دی ہے''۔

اس آیت میں مقدس سرزمین سے مراد فلسطین اور بیت المقدس ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس میں داخل ہونے کا حکم دیا اور انہیں یقین دہائی کرائی کہ اللہ نے اسے تمھارے لیے ہی لکھ رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ فلسطین کی سرزمین ان لوگوں کے لیے ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں نہ کہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے پہلے شریعت موسوی کو ماننے سے انکار کیا، پھر تورات میں تحریف کر ڈالی اور آخر میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت و شریعت کو بھی تسلیم نہ کیا۔

۴. **وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً** (سبا:۳۴:۱۸)

''اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان، جن میں ہم نے برکت دے رکھی تھی، چند بستیاں اور آباد کر رکھی تھیں جو برسرِ راہ ظاہر تھیں۔''

اس آیت میں برکت والی بستیوں سے مراد شام کی بستیاں ہیں، بہت سارے مفسرین مثلا مجاہد، قتادہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، زید بن اسلم اور ضحاک وغیرہ رحمہم اللہ نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔

۵. **وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ**

''قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینا کی، اور امن والے شہر کی۔'' (التین:۹۵:۱-۳)

حافظ ابن کثیر نے ان آیات کی تفسیر میں بعض آئمہ کرام سے نقل کیا ہے کہ یہ دراصل تین مقامات مقدسہ کی قسم ہے، جہاں اللہ رب لعزت نے تین اولوالعزم پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ پہلا مقام وہ جہاں انجیر اور زیتون کی پیداوار ہوتی ہے اور وہ ہے

بیت المقدس جس میں حضرت عیسی علیہ السلام مبعوث ہوئے ۔ دوسرا مقام طور سینا ہے جہاں حضرت موسی علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی اور تیسرا مقام مکہ مکرمہ ہے جہاں سید الرسل حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی ۔

۶ . وَ اَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا یُسۡتَضۡعَفُوۡنَ مَشَارِقَ الۡاَرۡضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا(الاعراف : ۷: ۱۳۷)

''اور ہم نے اس قوم کو جسے کمزور تصور کیا جاتا تھا، اس سرزمین کے مشرق ومغرب کا وارث بنادیا جس میں ہم نے برکت دے رکھی تھی ۔''

یعنی مصر میں شریعت موسوی پر ایمان رکھنے والے بنو اسرائیل کو کمزور قوم سمجھ کر ان پر ظلم کیا جاتا تھا، اللہ نے انہیں فرعون مصر اور اس کی ظالم افواج سے نجات دے کر بابرکت سرزمین یعنی شام کے مشرق ومغرب کا وارث بنادیا۔

(تفسیر ابن کثیر:۲/۳۲۳)۔

۷ . وَجَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡیَمَ وَ اُمَّہٗۤ اٰیَۃً وَّ اٰوَیۡنٰهُمَاۤ اِلٰی رَبۡوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیۡنٍ (المومنون:۲۳:۵۰)

''اور ہم نے مریم کے بیٹے (عیسی علیہ السلام) اور ان کی والدہ کو (اپنی قدرت کی) نشانی بنایا، اور ان کو ایک ٹیلے پر جگہ دی جو ٹھہرنے کے لائق تھی اور اس میں پانی جاری تھا''۔

آیت میں مذکورہ ٹیلے سے مراد کون سی جگہ ہے؟ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے ۔قتادہ اور ضحاک رحمہا اللہ نے اس سے بیت المقدس مراد لیا ہے اور حافظ ابن کثیرؒ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے ۔

شام کی فضیلت احادیث میں:

مندرجہ ذیل احادیث میں ''شام'' کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ اور بعد میں جس خطہ زمین کے لیے شام کا لفظ بولا جاتا ہے اس پر اب سوریا (اردو میں شام) لبنان، فلسطین اور اردن جیسے چھوٹے چھوٹے ملک پھیلے ہوئے ہیں ۔اس وقت اس مبارک سرزمین پر ''صہیونی مملکت'' کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے لیکن ایک وقت آئے گا جب یہ سرزمین خلافت اسلامیہ کا مرکز ہوگی ۔ دین الٰہی نافذ کیا جائے گا اور عدل وانصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں گے، تب مندرجہ ذیل احادیث میں مذکورہ حضور ﷺ کی بشارتیں سو فیصد پوری ہوں گی ۔

ا۔شام پر فرشتوں کی نگرانی:

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا!

''خوشخبری ہے شام کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں ہم نے کہا: وہ کیوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا شام پر اللہ کے فرشتوں نے اپنے پر پھیلا رکھے ہیں''۔(۵)

۲۔شام میں برکت:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دعا کرتے ہوئے فرمایا:

''اے اللہ! ہمارے شام میں برکت دے، اے اللہ ہمارے یمن میں برکت دے۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا اور ہمارے نجد میں تو آپ ﷺ نے پھر وہی دعا دی۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر کہا اور ہمارے نجد میں، تو آپ ﷺ نے فرمایا وہاں زلزلے آئیں گے، فتنے ہوں اور وہاں سے شیطان کا سینگ نکلے گا۔(۶)

یاد رہے کہ اس حدیث میں نجد سے مراد عراق ہے جسے آپ ﷺ نے فتنوں کا گڑھ قرار دیا۔

۳۔ اہل شام اللہ کی حفاظت میں:

حضرت عبداللہ بن حوالۃ الازدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔''عنقریب تم کئی فوجوں میں تقسیم ہو جاؤ گے، ایک فوج شام میں ہوگی، دوسری عراق میں اور تیسری یمن میں ہوگی۔

حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ میں کھڑا ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ سے گزارش کی کہ ان تینوں فوجوں میں سے ایک فوج میرے لیے منتخب کر دیجئے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا **علیک بالشام** یعنی تم لازمی طور پر شام کی فوج میں رہنا پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اس لیے کہ شام اللہ کی پسندیدہ زمین ہے اسی زمین کی طرف اللہ کے بندوں کے گروہ کو اکٹھا کیا جائے گا اور جس شخص کو شام کی فوج میں شمولیت سے انکار ہو وہ یمن چلا جائے اور اس کے پانیوں سے سیراب ہو، اور یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے شام اور اہل شام کی ضمانت دی ہے۔(۷)

۴۔ اہل شام سب سے اچھے لوگ:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عنقریب ایک ہجرت کے بعد دوسری ہجرت ہوگی تو روئے زمین پر بسنے والے لوگوں میں سے سب سے اچھے لوگ وہ ہوں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے ہجرت (شام) میں مستقل رہائش اختیار کریں گے۔(۸)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا کہنا ہے

''اس حدیث میں ہمارے ان دوستوں کے لیے بشارت ہے جنہوں نے حران (مشرقی شام) وغیرہ سے حضرات ابراہیم کی جائے ہجرت کی طرف ہجرت کی، اور ملت ابراہیمی اور دین محمدی کی پیروی کی۔'' (۹)

اور حضرت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

''قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک عراق کے اچھے لوگ شام میں اور شام کے برے لوگ عراق نہ چلے جائیں''۔ (۱۰)

۵۔ اہل شام کے ذریعے دین اسلام کی نصرت:

جب بڑی جنگیں واقع ہوں گی، اس وقت اللہ تعالیٰ دمشق سے موالی ایک گروہ کو مبعوث فرمائے گا، جو عربوں میں بہترین گھڑسوار اور سب سے اچھا اسلحہ رکھنے والا ہوگا۔ اللہ اسکے ذریعے دین اسلام کی نصرت فرمائے گا۔(۱۱)

۶۔ سرزمین شام، ایمان والوں کی آخری پناہ گاہ:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا

عنقریب قیامت سے پہلے حضرموت کے سمندر سے (یا حضرموت سے) ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو اکٹھا کرے گی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا، تو آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپﷺ نے فرمایا: تم شام میں مستقل اقامت رکھنا۔(۱۲)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہﷺ سے سوال کیا کہ آپ کا آغاز کس طرح سے تھا؟ تو آپؐ نے فرمایا:

میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰؑ کی بشارت (سے میرا آغاز ہوا) اور میری ماں نے خواب میں دیکھا کہ اس سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔(۱۳)

حافظ ابن کثیرؒ یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں

''یہ جو آپﷺ نے ملک شام کو اپنے نور کے ساتھ خاص کیا ہے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ آپﷺ کے دین کو شام میں استقرار نصیب ہوگا، اور یہی وجہ ہے کہ شام کی سرزمین آخر کار اسلام اور اہل اسلام کی آخری پناہ گاہ ہوگی اور اسی پر جنت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا''۔(تفسیر ابن کثیر:۱/۲۵۳)

حضرت عبداللہؓ بن عمرو العاص سے مروی ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا

میں نے (خواب) دیکھا کہ میرے تکیے کے نیچے سے کتاب کا ستون (ایمان) کھینچ لیا گیا ہے، میری نظر نے اس کا پیچھا

کیا، دیکھا تو وہ ایک نور تھا، جو شام کی طرف چمک رہا تھا، خبردار! جب فتنے ہوں گے تب ایمان شام میں ہوگا۔(۱۴)

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں۔

ایک وقت آئے گا جب ہر مومن شام ہی کی طرف جائے گا۔(۱۵)

۷۔ شام میں نزول عیسیٰ علیہ السلام:

ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

حضرت عیسیٰؑ ابن مریم دمشق کے مشرق میں سفید مینار پر نازل ہوں گے۔''(۱۶)

شام اور مشرق وسطیٰ آگ کی لپیٹ میں:

احادیث بڑی کثرت سے ان حالات کا تذکرہ کرتی ہیں جو شام اور مشرق وسطیٰ میں پیش آئیں گے۔ان دنوں کی مصیبت نہایت سخت اور ہلاکت بہت زیادہ ہوگی۔لوگ امن کی تلاش میں مارے مارے پھریں گے۔جنگ بھوک بیماری اور آنے والے وقت کا دھڑکا انہیں ہر دم بے کل اور پریشان کیے رکھے گا۔ان حالات کا قبل از وقت پوری طرح اندازہ ممکن نہیں ہوسکتا۔مگر احادیث پاک پر غور وخوض کے نتیجہ میں جو نقشہ سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ سارا مشرق وسطیٰ جنگ کے شعلوں میں گھر جائے گا اور عیسائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان اپنی قوت کو چار جگہوں پر مجتمع کرنے کی کوشش کریں گے۔ان میں سے ایک تو وہی حجاز ہے جس میں مسلمان سمٹ جائیں گے اور باقی تین وہ ہیں جن کا ذکر آگے آنے والی عبداللہ بن حوالہؓ کی حدیث میں نہایت وضاحت وصراحت سے وارد ہوا ہے۔

عراق سے شام کی جانب:

''حضرت انسؓ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی ایک آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی جانب ہنکائے گی۔''(۱۷)

''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک آگ مسلط ہوگی اہل مشرق پر جو انہیں مغرب کی طرف جمع کردے گی۔انہیں کے ساتھ رات بتائے گی جہاں وہ رات بتائیں گے اور انہیں کے ساتھ قیلولہ کرے گی جہاں وہ قیلولہ کریں گے۔اور اس کے لیے وہ ہوگا جو ان سے گر جائے یا پیچھے رہ جائے اور وہ انہیں ایسے ہانکے گی جیسے زخمی اونٹ کا ہانکنا ہوتا ہے۔'' (۱۸)

اس آگ کے دن رات ساتھ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی جنگ ہوگی جو سانس لینے کی مہلت نہیں دے گی۔ جو کچھ ہجرت کرنے والے چھوڑ جائیں گے اور جو باقی رہ جانے والے ہوں گے وہ اس جنگ کی تباہ کاریوں سے بچ نہیں سکیں گے۔ ہنکائے جانے والے لوگ کس حال میں ہوں گے اس کا اندوہناک منظر یہ حدیث ان الفاظ میں پیش کرتی ہے کہ وہ اس طرح ہنکائے جائیں گے جیسے زخمی ہوا اونٹ مار مار کر اور دھکے دے دے کر چلایا جاتا ہے۔ مصیبتوں ہلاکتوں، غموں اور تباہیوں کے پے در پے کوڑے مارتے ہوئے یہ جنگ نجد و عراق کے لوگوں کو شام کے اس حصہ میں لے جا کر جمع کرے گی جو نسبتاً محفوظ ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑی اور عالمگیر جنگ کی خبریں ہیں جو شام پر مکمل قبضہ کے لیے لڑی جائے گی اور جس میں نجد و عراق سے ہو کر یورپی افواج شام کی طرف بڑھیں گی۔ یمن واومان سے بھی یہ لشکر مسلمانوں کی قوت توڑ کر شام کا رخ کریں گے اور شام کے ساحلی علاقوں پر ان کا نزول ہوگا۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو شام کے ملک میں جمع ہونے کے تاکیدی احکامات کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے۔

یمن سے شام کی جانب:

''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: قریب ہے کہ ایک آگ حضرموت سے نکلے گی جو لوگوں کو اکٹھا کرے گی تو ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: تم پر لازم ہے کہ شام سے چمٹ جاؤ۔'' (۱۹)

تین عظیم مسلم لشکر:

عرب کے مسلمان جب عیسائیوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھائیں گے اور مدینہ میں محصور ہوجائیں گے تو پھر اس بلائے ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لیے اہل ایمان افواج اکٹھی کریں گے۔ یہ فوجیں شام یمن اور عراق میں جمع کی جائیں گی۔

''حضرت عبداللہ بن حوالہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جلد ہی یہ معاملہ پیش آئے گا کہ تم تین لشکروں کی صورت میں جمع کیے جاؤ گے۔ ایک لشکر شام میں اور ایک لشکر یمن میں اور ایک لشکر عراق میں۔'' اس پر حضرت ابن حوالہؓ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ میرے لیے کیا پسند فرماتے ہیں؟ اگر میں اس صورت حال کو پالوں تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: شام کے لشکر کے ساتھ رہنا بے شک وہ اللہ کی پسندیدہ سرزمین ہے اور اس کی طرف وہ اپنے پسندیدہ بندے چنتا ہے۔ پس اگر تم یہ نہ چاہو تو یمن کو اختیار کرنا اور اس کے حوضوں سے پانی پینا۔ بے شک اللہ نے میری خاطر شام اور اس کے رہنے

والوں کا ذمہ لے لیا ہے'' (یعنی ذمہ داری اٹھانے کا عہد کیا ہے)۔(۲۰)

اس بارے میں ایک جامع حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:

''حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب جنگوں پر جنگیں ہوں گی تو اللہ تعالیٰ موالی عرب اقوام میں سے ایک قوم کو اٹھا کر کھڑا کرے گا۔ وہ شہسواری میں عربوں سے بہتر اور اسلحہ میں ان سے برتر ہوں گے۔ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد کرے گا۔(۲۱)

شام پر تباہی کا دور:

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے فوراً بعد جو ملک جنگ کا نشانہ بنے گا وہ شام ہوگا۔ اس کا اشارہ اس حدیث میں بھی ہے جو جنگ کی آگ کا مشرق سے مغرب یعنی عراق سے شام کی طرف بڑھنا بتاتی ہے۔ ترغیب کی وجہ تو یہ ہے کہ شام میں آخری معرکہ بھی ہوگا اسی لشکر میں عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی۔ جب کہ اس لشکر میں لوگوں کی شمولیت کے لیے راضی نہ ہونے کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ ابتدا میں شامی لشکر کا حال بھی عراقی لشکر والا ہوتا نظر آئے یا صحیح تر الفاظ میں ہو چکا ہو۔ احادیث پاک کو باہم جوڑنے سے جو تصویر بنتی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بالائی شام ایک سخت اور خونریز جنگ سے گزرے گا یہاں تک کہ دمشق اور اس کے حصار کے سوا سارے ملک میں تباہی اور بربادی کا راج ہوگا۔ شام کے خلاف اہل یورپ جس بنیاد پر جنگ شروع کریں گے اس کا ذکر صحیح مسلم شریف کی ایک حدیث میں کیا گیا ہے۔ یہ حدیث مبارکہ جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، اپنے پہلے جملہ میں ہی یہ وضاحت کردیتی ہے کہ شام کے بالائی حصہ پر یورپی نصرانی دھاوا بولیں گے:

''حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں: قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ روم (اہل یورپ) اعماق یا دابق پر نازل نہ ہوں۔ پھر ان کی طرف مدینہ سے ایک لشکر نکلے گا جو اس وقت کے زمین کے بہترین لوگوں پر مشتمل ہوگا۔ پھر جب وہ صف آرا ہو جائیں گے، تو اہل روم ان سے کہیں گے کہ ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان سے ہٹ جاؤ جنہوں نے ہمارے لوگ قیدی بنا لیے ہیں وہ کہیں گے کہ ہرگز نہیں خدا کی قسم! ہم تمھارے اور اپنے بھائیوں کے درمیان سے نہیں ہٹیں گے۔ پھر وہ ان سے جنگ کریں گے تو ایک تہائی بھاگ جائیں گے جن پر اللہ کبھی اپنی رحمت نہ ڈالے گا۔ ایک تہائی قتل ہو جائیں گے جو اللہ کے نزدیک افضل ترین شہید ہوں گے اور ایک تہائی فتح پا کر ہمیشہ کے لیے ایمان کی آزمائش والے فتنوں سے محفوظ ہو جائیں گے، پھر یہی لوگ قسطنطنیہ فتح کریں گے۔'' (۲۲)

شام، مجاہدین اور مہاجرین کا ٹھکانہ:

مشرق وسطیٰ میں برپا ہونے والی تیسری عالم گیر جنگ کے دوران میں شام کا علاقہ ایک خاص اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے۔شام کا قدیم ملک برطانوی اور فرانسیسی سازشوں کے نتیجہ میں آج پانچ مختلف ملکوں میں منقسم ہے یعنی شام، اردن، فلسطین (مجوزہ)، لبنان اور اسرائیل۔متعدد احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شام کا کوئی علاقہ ہجرت گاہ ہوگا اور کوئی میدان جنگ۔

حضرت معاویہ بن وجیدہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: تم جمع کیے جاؤ گے، پھر ہاتھ سے شام کی طرف اشارہ فرمایا (اور کہا) پیادہ پا بھی سوار بھی اور تم منہ کے بل گھسیٹے جاؤ گے۔''(۲۳)

یہ حدیث شام کے صرف ہجرت گاہ ہونے کی خبر ہی نہیں دیتی بلکہ یہ بھی بتا رہی ہے کہ شام کی طرف ہجرت کرنے والوں میں ایک قسم تو ان لوگوں کی ہوگی جو از خود ہجرت کر جائیں گے اور دوسری قسم ان ستم رسیدہ لوگوں کی ہوگی جو جنگ کے ہاتھوں زک اٹھا تے اٹھاتے شام میں جا پہنچیں گے۔بخاری شریف کی ایک حدیث اس معاملہ کو مزید واضح کر کے سامنے لاتی ہے:

ابی ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگ اکٹھے ہوں گے تین طرح سے۔ایک تو رغبت سے آنے والے ہوں گے، دوسرے خوف سے۔اور ان کا حال یہ ہوگا کہ ایک اونٹنی پر دو بھی سوار ہوں گے اور تین بھی اور چار بھی اور کسی پر دس بھی (یعنی باری باری)، اور بقیہ کو آگ جمع کرے گی۔انہیں کے ساتھ دوپہر کرے گی، جہاں وہ دوپہر کریں گے اور انہیں کے ساتھ رات بتائے گی جہاں وہ رات بتائیں گے، انہیں کے ساتھ صبح کرے گی جہاں وہ صبح کریں گے اور انہیں کے ساتھ شام کرے گی جہاں وہ شام کریں گے۔'' (۲۴)

پچھلی احادیث کی تشریح کے لیے یہ حدیث بڑی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔شام کی حیثیت ہجرت گاہ میدان جنگ کی ہوگی اس لیے ایک طرف تو اس حدیث کے مطابق جہاد وقتال کی رغبت رکھنے والے اہل ایمان شام کا رخ کریں گے اور دوسری طرف جنگ کی ہولناکیوں سے خوفزدہ لوگ شام کے اس حصہ کی طرف ہجرت کریں گے جو باقی عرب کی نسبت کچھ محفوظ ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جلد ہی ہجرت پر ہجرت ہوگی۔پس ملک کے بہترین لوگ ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت گاہ کو لازماً اختیار کریں گے اور ملک میں اس کے بدترین لوگ رہ جائیں گے۔ان کے علاقے ان کو اگل دیں گے اور اللہ ناپسند کرے گا ان کو (یعنی شام میں ان کے جمع ہونے کو) پس آگ ان کو بندروں اور سوروں کے ساتھ اکٹھا کر دے گی۔(۲۵)

معجزاتی نوعیت رکھنے والی یہ حدیث مشرق وسطیٰ میں در پے در پے بھڑ کنے والی جنگوں کی خبر دے رہی ہے۔خلیج کے علاقہ میں تمام باطل قوتوں کا اجتماع ایک ایسی شر انگیز صورت حال کو پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے جس نے اس سارے علاقہ کو بارود کا ڈھیر بنا دیا ہے۔اب اس ڈھیر کو چنگاری دکھلانے کی دیر ہے کہ سارے عرب ممالک یکے بعد دیگر اس کے دھماکہ سے اڑ کر رہ جائیں گے۔ہجرت پر ہجرت میں دراصل جنگ پر جنگ کی خبر بھی پوشیدہ ہے اور یہ اشارہ بھی کہ یہ ہجرت کسی ایک ملک کی طرف ہی نہیں بلکہ کئی اطراف میں ہوگی۔عرب ممالک پر جب موت کا یہ پھندا پڑے گا تو پناہ کی تلاش میں لوگ بھاگے بھاگے پھریں گے۔ایسے میں وہ لوگ جو یقیناً ہر ملک کا سب سے عمدہ طبقہ ہوتے ہیں شام کے بارے میں اس یقین دہانی کو پیش نظر رکھ کر کہ عیسائیوں کے خلاف اللہ تعالیٰ نے اس کا ذمہ لے لیا ہے ضرور اس کی طرف ہجرت کریں گے (**فان الله تو کل لی بالشام و اھله**، اللہ نے شام اور اس کے رہنے والوں کا ذمہ میری خاطر لے لیا ہے۔(۲۶)

ان احادیث سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مشرق کا علاقہ ایک نہایت خوفناک جنگ کا میدان بنے گا۔یہ عظیم جنگ ایک ایسی آگ سے تعبیر کی گئی ہے جو یمن و اومان سے شام و ترکی اور خراسان و ایران سے حجاز تک پھیلی ہوئی ہوگی۔حضرت ذو مخبر کی روایت میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ صلح شکنی کے حادثہ کے بعد نصرانی شام کے علاقہ میں جمع ہوں گے و تجمع للملحمة سے مراد شام میں جمع ہونا ہی ہے کیونکہ کئی احادیث میں تواتر سے یہ خبر دی گئی ہے کہ شام ہی جنگ عظیم کا وہ میدان ہے جہاں طاقتوں کا مدفن بنے گا۔شام کی جو جنگ صلح شکنی کے لیے شروع ہوگی وہ پے در پے معرکوں کے ساتھ اختتام پذیر ہوگی اس لیے شام میں ہر طرف سے آنے والی عیسائی افواج جمع ہوتی جائیں گی۔

مراجع وحواشی:

۱۔ ظفر الحق، محمد قاضی، مشرق وسطی کی صورت حال اور قیامت کے آثار، الصفۃ دار النشر، ۲۰۰۰ء، ص:۹۳

۲۔ الطبری، ابی جعفر محمد بن جریر، جامع البیان من تاویل ای القرآن، دار المفکر، بیروت، لبنان، س،ن، ۳۶/۱۰

۳۔ ابن کثیر، عماد الدین ابی الفداء اسماعیل القرشی، الدمشقی تفسیر القرآن العظیم، مکتبہ دار السلام للنشر والتوزیع، ریاض ۱۹۹۴ء، ۲۳۷/۳

۴۔ السعدی، عبدالرحمٰن بن ناصر، تیسیر االکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۷ء، ص:

۵۔ الترمذی، ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ ابن موسیٰ، جامع الترمی، دار السلام للنشر والتوضیع الریاض، ۱۹۹۹ء، کتاب المناقب، باب فی فضل الشام، رقم الحدیث:۳۹۵۴، ص:۸۸۸

۶۔ البخاری، ابی عبداللہ محمد بن اسماعیل، الجعفی، الامام، صحیح البخاری، دار اسلام پبلشرز، التوزیع الریاض، ۱۹۹۹، کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ (الفتنه من قبل المشرق) رقم الحدیث، ۷۰۹۴، ص:۱۲۲۲

۷۔ ابی داؤد، سلیمان بن الاشعث بن الاسحاق الاذدی الجستانی، الامام الحافظ، سنن ابی داؤد، دار السلام للنشر والتوزیع الریاض، ۱۹۹۹ء، کتاب الجہاد، باب فی سکنی الشام، رقم الحدیث:۲۴۸۳، ص:۳۵۹

۸۔ الحاکم، ابی عبداللہ، المستدرک علی الصحیین، کتاب الفتن، والملاحم، دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان، س۔ن، اسنادہ حسن، ۴/۵۱۰

۹۔ ابن تیمیہ، احمد، شیخ الاسلام، مجموع فتاویٰ، دار العربیہ والنشر والتوزیع، بیروت لبنان، س۔ن۔ ۲۷/ ۵۰۹

۱۰۔ احمد بن حنبل، الاما، مسند، المکتب الاسلامی، دار ابہادر بیروت، لبنان، س۔ن۔ واسنادہ حسن، ۵/ ۲۴۹

۱۱۔ ابن ماجہ، ابی عبداللہ محمد بن یزید الربعی القزوینی، سنن ابن ماجہ، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۹۹۹، کتاب الفتن، باب الملاحم، رقم الحدیث: ۴۰۹۰، ص:۵۹۶

۱۲۔ جامع الترمذی، الفتن، باب لاتقوم الساعۃ حتی تخرج نار من قبل الحجاز، رقم الحدیث: ۲۲۱۷، ص:۵۰۹

۱۳۔ الطبرانی، سلمان بن احمد، ابی القاسم الحافظ، المعجم الکبیر، رقم الحدیث: ۲۹۷۷، مطبۃ الزہراء الحدیثیہ بالموصل، ۱۹۸۳،

رقم الحدیث ۳۹۷۷،۸/۱۷۵

۱۴۔ المستدرک للحاکم، کتاب الفتن والملاحم واسنادہ حسن، رقم الحدیث: ۴/۵۰۹

۱۵۔ المستدرک للحاکم، کتاب الفتن واعلام، ۴/۴۵۷، وقال الحاکم، ھذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین، وافقہ الذھبی، ۴/۴۵۷

۱۶۔ **المسلم، الامام ابی الحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری النیسابوری،** صحیح مسلم، دارلسلام للنشر والتوزیع الریاض، ۲۰۰۰، کتاب الفتن، باب ذکر الدجا، رقم الحدیث: ۲۹۳۷، ص: ۱۲۷۱

۱۷۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب خروج النار، ص: ۱۲۲۶

۱۸۔ الہیثمی، نورالدین، علی بن ابی بکر، الحافظ، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، دارالکتاب بیروت، لبنان، س۔ن، باب فیما یکون من الفتن، ۷/۳۰۵

۱۹۔ الترمذی، کتاب الفتن، باب لاتقوم الساعۃ حتی تخرج نار من قبل الحجاز، رقم الحدیث: ۲۲۱۷، ص: ۵۰۹۔

۲۰۔ ابی داؤد کتاب الجہاد، باب فی سکنی الشام، رقم الحدیث: ۲۴۸۳، ص: ۳۵۹

۲۱۔ ابن ماجہ کتاب الفتن، باب الملاحم، رقم الحدیث: ۴۰۹۰، ص: ۵۹۶، الالبانی، ناصرالدین، محمد، فضائل الشام ودمشق، مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع ریاض ۲۰۰۰ء، ۱/۲۱

۲۲۔ مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ، باب: فی فتح قسطنطینہ وخروج الدجال ونزول عیسی ابن مریم، رقم الحدیث: ۲۸۹۷، ص: ۱۲۵۴

۲۳۔ ظفرالحق، مشرق وسطی کی صورت حال اور قیامت کے آثار ص: ۱۰۷

۲۴۔ البخاری، کتاب الرقاق باب لحشر، رقم الحدیث: ۶۵۲۲، ص: ۱۱۳۰

۲۵۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی سکنی الشام رقم الحدیث: ۲۴۸۲، ص: ۳۵۹

۲۶۔ رواہ الترمذی، صفۃ القیامہ، باب، ماجاء فی شان الحشر، رقم الحدیث: ۲۴۲۴، ص، ۵۵۲

الہامی وغیر الہامی مذاہب میں ذبیحہ کا تصور

کنیز فاطمہ*

ذبح کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی نوعِ انسانی، جانور کو تقرب الٰہی کی نیت سے ذبح کرنے کی تاریخ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کی قربانی سے ہی شروع ہو جاتی ہے اور یہ دنیا کا سب سے پہلا ذبیحہ تھا۔ جسے قرآن کریم یوں بیان فرماتا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَابْنَىْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ (۱)

اور (اے نبی) انہیں آدمؑ کے دو بیٹوں کی سچی خبر پڑھ کر سناؤ جب دونوں نے ایک ایک کی قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی طرف سے قبول کر لی گئی اور دوسرے کی طرف سے قبول نہیں کی گئی۔

آیتِ طیبہ سے واضح ہوا کہ ذبیحہ کی ابتداء سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے ہی ہے اور اس کا تصور تقریباً ہر نبی کی شریعت میں موجود رہا۔ کتبِ تاریخ میں ملتا ہے کہ سیدنا نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مذبح بنایا تھا جس میں وہ جانوروں کو اللہ جل مجدہٗ کی راہ میں قربان کیا کرتے تھے۔ اسرائیلی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی جانوروں کی قربانی کیا کرتے تھے، شریعتِ موسویہ میں بھی قربانی اور ذبیحہ کی ایک خاص اہمیت تھی۔

قرآن کریم کی روشنی میں مذاہبِ عالم میں ذبیحہ کا تصور:

مذاہبِ عالم میں تصور ذبیحہ کی گواہی اللہ جل مجدہٗ نے قرآن کریم میں دی ہے، سورۃ حج میں اللہ جل مجدہٗ اس حقیقت کو بیان فرماتا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَارَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ

---

*ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی

اَسۡلِمُوۡا وَ بَشِّرِ الۡمُخۡبِتِیۡنَ ۔(2)

''اور ہر امت کے لئے ہم نے قربانی کا ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے تاکہ (اس امت کے) لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں (ان مختلف طریقوں کے اندر مقصد ایک ہی ہے) پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اسی کے تم مطیع وفرمان بنو اور اے نبی ﷺ عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دو۔''

معلوم ہوا سابقہ تمام امتوں کے لئے اللہ جل مجدہٗ نے قربانی کا ایک خاص طریقہ مقرر کیا اور اس کا مقصد یہ کہ وہ جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ جل مجدہٗ کا نام لیں۔

تفسیر خازن میں ہے کہ ''اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ جانور ذبح کرتے وقت اللہ جل مجدہٗ کا نام ذکر کرنا شرط ہے اور اللہ جل مجدہٗ نے ہر اُمت کے لئے مقرر فرما دیا تھا کہ وہ اس کے لئے تقرب کے طور پر قربانی کریں اور تمام قربانیوں پر صرف اسی کا نام لیا جائے۔''(3)

شریعتِ محمدی ﷺ میں ذبیحہ کا تصور:

دینِ اسلام میں ذبیحہ ایک مذہبی شعار کی حیثیت رکھتا ہے جیسے سابقہ امم میں قربانی کو مذہبی عبادت کی حیثیت حاصل رہی اسی طرح دینِ اسلام میں بھی قربانی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **فصل لربک وانحر**۔اور نماز پڑھو اور اپنے رب کے لئے قربانی کرو۔(4)

اس کی خاص پہچان اور شان حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ سے ہوئی اور اسی کی یادگار کے طور پر امتِ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر قربانی کو واجب قرار دیا گیا۔حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہٗ سے مروی ہے انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم سے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم قربانی کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے فرمایا تمہارے والد حضرت ابراہیم علیہ والصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔عرض کی گئی ہمیں اس سے کتنا ثواب ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے فرمایا ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی صحابہ نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم اُون کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے فرمایا اُون کے ہر ریشے کے بدلے میں ایک نیکی (5)

دین اسلام کا امتیازی وصف یہ ہے کہ حلال وحرام معاملات اور اشیائے خورونوش کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے اور

مسلمانوں کے لئے ایسے گوشت کو حلال قرار دیا ہے جسے اسلامی تقاضوں کے مطابق ذبح کیا گیا ہو اور وہ گوشت بھی ایسے جانور کا ہو جسے کھانا شریعتِ مطہرہ حلال رکھتی ہے۔

قرآن کریم میں اللہ جل مجدہٗ فرماتا ہے:

وَلَاتَاکُلُوْا مِمَّالَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاِنَّہٗ لَفِسْقٌ" (6)

" اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسے نہ کھاؤ بے شک یہ نافرمانی ہے۔"

ایک اور مقام پر فرمایا:

فَکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کُنْتُمْ بِاٰیٰتِہٖ مُؤْمِنِیْنَ۔ (7)

"اس میں سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو۔"

مذکورہ آیاتِ طیبات سے واضح ہوا کہ حلال جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ جل مجدہٗ کا نام ذکر کرنا ضروری ہے اگر جان بوجھ کر نامِ مبارک ذکر نہیں کیا تو جانور حلال نہیں ہوگا۔

قال ابو حنیفه و مالک و الثوری و جماهیر العلماء : ان ترکها سهوا حلت الذبیحه، وان ترکها عمداً فلا ۔(8)

امام اعظم ابوحنیفہ و مالک، ثوری اور جمہور علماء کا مذہب ہے کہ اگر بھول سے بسم اللہ نہ پڑھا تو ذبیحہ حلال ہے اور اگر قصداً نہ پڑھا تو حرام ہے

قومِ یہود میں ذبیحہ کا تصور:

قومِ یہود میں بھی ذبیحہ کا تصور موجود ہے اور اسلام سے قبل یہودیوں نے اپنے لئے خشکی اور تری کے بہت سے جانور حرام کر لئے تھے اور اللہ جل مجدہٗ نے ان کے کفر اور سرکشی کے باعث ایک ناخن والے تمام جانور اور پرندے یعنی جن کے کھر درمیان سے پھٹے ہوئے نہ ہوں جیسے ہنس، شترمرغ، بطخ، اونٹ وغیرہ۔ گائے اور بھیڑ کی چربی وغیرہ بھی ان کے لئے حرام کر دی گئی تھی۔ اللہ جل مجدہٗ نے اسے قرآن عظیم میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَعَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَا اِلَّا مَاحَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَا

اَوِ الْحَوَايَا اَوْمَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذٰلِکَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۔(9)

''اور ہم نے یہودیوں پر ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا اور ہم نے ان پر گائے اور بکری کی چربی حرام کر دی سوائے اس چربی کے جو ان کی پیٹھ کے ساتھ یا انتڑیوں سے لگی ہو یا جو چربی ہڈی سے ملی ہوئی ہو ہم نے یہ ان کی سرکشی کا بدلہ دیا اور بے شک ہم ضرور سچے ہیں۔''

امام قرطبی مذکورہ آیتِ طیبہ کے تحت فرماتے ہیں: یہودیوں پر یہ چیزیں آزمائش اور سزا کے طور پر حرام کی گئی تھیں۔

مشرکینِ مکّہ کے نزدیک قربانی کا تصور:

زمانۂ جاہلیت میں عرب میں بعض حلال جانوروں کے گوشت کو حرام اور حرام کردہ جانوروں کے گوشت کو حلال سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح ایسے جانور جنہیں وہ اپنے بتوں کے تقرب اور ان کے شر سے بچنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتے تھے ان کا گوشت حرام سمجھتے تھے۔

قرآن کریم میں بھی ان کا ذکر موجود ہے

مَاجَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَاسَائِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍوَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ اَكْثَرُهُمْ لَايَعْقِلُوْنَ ۔(10)

اللہ نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام کو مقرر نہیں کیا لیکن کافر لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان لگاتے ہیں اور ان میں اکثر بے عقل ہیں۔

بحیرہ:

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق

عن الزهری قال سمعت سعید بن المسیب قال البحیرة التی یصنع درها للطواغیت ولا یحلبها أحد من الناس . (11)

بحیرہ سے مراد وہ اونٹنی ہے جو پانچ بار حاملہ ہو چکی ہو اور اس کا آخری بچہ نر ہو' عربوں کا طریقہ تھا کہ ایسی اونٹنی کے کان چیر دیتے تھے اور اس پر نہ سواری کرتے تھے اور نہ ہی اس سے کام لیتے اور نہ ہی اسے ذبح کرتے تھے اور بغیر کسی روک ٹوک کے وہ کسی بھی چراگاہ سے چر لیتی تھیں۔

وصیلہ:

وصیلہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو دس مرتبہ بیاہی جا چکی ہو یا پھر وہ بکری جو چھ مرتبہ بیاہی جا چکی ہو اور جب وہ ساتواں بچہ دیتی ہے تو اس کے کان اور سینگ کاٹ دیتے اور کہتے یہ پہنچی ہوئی ہے لہٰذا اس کو نہ ذبح کرتے اور نہ ہی اسے کسی حوض پر پانی پینے سے روکتے۔

حام:

حام سے مراد وہ اونٹنی تھی کہ جس پر کوئی بوجھ وغیرہ نہ لادتے تھے۔(12)

اسی طرح ایک اور آیتِ طیبہ میں اللہ جل مجدہٗ نے مشرکین کے اس قبیح فعل کی مذمت فرمائی ہے۔

قُلْ لَا أَجِدُ فِيْمَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ''(13)

تم فرماؤ جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، اس میں کسی کھانے والے پر میں کوئی کھانا حرام نہیں پاتا مگر یہ کہ مُردار ہو یا رگوں میں بہنے والا خون ہو یا سُور کا گوشت ہو کیونکہ وہ ناپاک ہے یا وہ نافرمانی کا جانور ہو جس کے ذبح میں غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو تو جو مجبور ہو جائے وہ اس حال میں کھائے کہ نہ خواہش سے بڑھ کر کھانے والا ہو اور نہ ضرورت سے بڑھنے والا تو بے شک آپ کا رب بخشنے والا مہربان ہے۔

آیتِ طیبہ میں اللہ جل مجدہٗ نے اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: آپ ان جاہل مشرکین سے کہہ دیجئے جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اس میں سوائے چار اشیاء کے اور کچھ بھی حرام نہیں لہٰذا تمہارا دیگر تمام چیزوں کو حرام کہنا باطل ہے۔

احادیثِ طیبہ میں بھی عربوں کے اس قبیح فعل کی مذمت کی گئی ہے۔

قال ابوھریرۃ قال النبی صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم: رَأیت عمرو بن عامر بن لحی الخزاعی یجر قصبہ فی النار و کان اول من سیب السوائب (14)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہٗ سے مروی ہے حضور ﷺ نے فرمایا میں نے عمر بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی انتڑیاں گھسیٹ کر چل رہا ہے یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے سائبہ بنانے کی رسم ایجاد کی۔

سائبہ:

التی کانوا یسیبونھا لاٰلھتہ فلا یحمل علیھا شیٔ"

سائبہ اُس جانور کو کہتے ہیں جسے وہ بُتوں کے لئے چھوڑ دیتے تھے اور اُن پر کوئی بھی نہ بوجھ لادتا تھا اور نہ سواری کرتا تھا۔

اسی طرح تفسیر قرطبی میں علامہ قرطبی زمانۂ جاہلیت کے ذبیحوں کا تصور بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب مُردار، بہنے والے خون، چوٹ لگ کر، اونچائی سے گر کر اور سینگ لگ کر مرنے والے جانوروں کو بھی اپنے لئے حلال سمجھتے تھے۔(15)

نصاریٰ کے ذبیحے:

نصرانی ہر قسم کے جانور کا گوشت اپنے لئے حلال سمجھتے تھے خواہ وہ کسی بھی طرح ذبح کیا گیا ہو۔ اور خنزیر کا گوشت بھی حلال سمجھتے تھے حالانکہ وہ شرعاً ان پر حرام تھا۔(16) عہد نامہ قدیم میں یہ صراحت ہے کہ جانور کا گلا کاٹ کر خون بہا دیا جائے یہی ذبح ہے اسی طرح بائبل میں جانوروں کے حلال وحرام ہونے کا بھی ذکر موجود ہے لیکن عہد نامہ جدید میں جانوروں کے ذبح کے بارے میں کوئی ہدایت موجود نہیں اور نہ ہی حلت وحرمت کا کوئی ذکر موجود ہے۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ہمارے مذہب میں تو ساری غذائیں پاک ہیں، ذبح کی کوئی پابندی نہیں بغیر ذبح کے بھی جانور حلال ہے۔

عہد نامۂ قدیم میں ذبح کے سلسلے میں جو ہدایات ہیں وہ یہودیوں کے لئے تھیں اور اسی وقت تک کے لئے تھیں جبکہ عہد نامہ قدیم نے جدید کی تکمیل کی ہے اور قدیم میں ذبح کے بارے میں جو کچھ ہے ان سب کو جدید نے منسوخ کر دیا ہے کیونکہ عہد نامہ جدید میں یہ صراحت ہے کہ کوئی غذا Unclean یعنی ناپاک نہیں ہے۔(17)

غیر الہامی مذاہب میں ذبیحہ کا تصور:

غیر الہامی مذاہب میں ذبح کا مقصود مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ ذبح کے بھی مختلف طریقے رائج تھے جن میں مذہب سے زیادہ علاقائی ثقافت کا چلن غالب رہا یہاں تک کہ بعض صورتیں تو نہایت غیر عاقلانہ اور نامعقول بھی تھیں جیسا کہ انسانوں کو قربانی کے طور پر اپنے جھوٹے خداؤں کی بھینٹ چڑھا کر ذبح کر دینا۔ اور بعض لوگ اپنے معصوم بچوں کو خودساختہ

خداؤں کے نام پر قربان کردیا کرتے تھے۔

دومۃ الجندل کے لوگ ہر سال خاص انداز سے ایک شخص کا انتخاب کرتے اور اپنے خداؤں اور بُتوں کے حضور اسے قربان کردیتے اور پھر اسے قربان گاہ کے قریب دفن کردیتے۔

عبدالصبور شاکر اپنے مقالے ''مذاہبِ عالم میں قربانی کا تصور'' میں مختلف ملکوں اور قوموں کے ہاں قربانی کے تصور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''افریقہ' جنوبی امریکہ' انڈونیشیا اور جرمنی کے بعض قبائل اپنے دیوتاؤں کے غضب سے بچنے' ان کی خوشنودی حاصل کرنے' کسی ناگہانی آفت مثلاً بادشاہ کی موت کے وقت انسانوں کو ذبح کردیا کرتے تھے اور اپنے دانست میں اسے بہترین قربانی تصور کرتے تھے۔جس کی تصدیق ان ہڈیوں سے ہوتی جنہیں آثارِقدیمہ کے ماہرین نے کھدائی کے دوران برآمد کیا ہے کریٹ کے قلعے سے ملنے والی بچوں کی ہڈیاں بھی اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ انہیں ذبح کیا گیا تھا۔''(18)

غیرالہامی مذاہب میں ذبیحہ کا ممنوع ہونا:

اسی طرح بعض مذاہب میں اصلاً ذبیحہ کا کوئی تصور موجود نہیں جیسے کہ بدھ مت' ہندومت کے بعض فرقوں میں کے ہاں ذبح کرنا ممنوع ہے اور قربانی کا بھی کوئی تصور موجود نہیں۔

شرعی طریقے سے جانور ذبح کرنے کے فوائد:

دینِ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اس میں موجود ہر ہر حکم نہایت ہی جامع و ہمہ گیر وسعت رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام میں ذبیحہ کا نہایت ہی عمدہ تصور موجود ہے اور جانوروں کی گردن پر تکبیر پڑھ کر چُھری چلانے کے حکم پر اگر تحقیق کی جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ گردن ہی جانور کے جسم کا وہ واحد حصہ ہے کہ جس پر چُھری چلانے سے حیوان کے جسم کا سارا خون بہہ جاتا ہے اور اس کا گوشت مکمل طور پر تمام زہریلے وفاسد مادوں سے نا صرف پاک ہوجاتا ہے بلکہ صحتِ انسانی کے لئے بھی فقط یہی گوشت بےضرر اور فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

اسی طرح ذبیحہ کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جانور کا سر تکبیر پڑھنے کے بعد مکمل جدا نہیں کیا جاتا بلکہ شہہ رگ تک کاٹا جاتا ہے پھر کاٹنے کا عمل موقوف کردیا جاتا ہے جب تک اس کا سانس مکمل طور پر نہ نکل جائے اور جسم ٹھنڈا ہوجائے۔یہ طریقہ آسان ترین اور بہترین طریقۂ ذبح ہے جو شرعی ذبیحہ ہونے والے جانوروں کو اسلام کی طرف سے عطا ہوا ہے۔اسی طریقے

میں موت کی تکلیف سب سے کم ہوتی ہے، بلکہ غیر مسلم محققین کی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شرعی ذبح کی صورت میں جانور کو تکلیف ہوتی ہی نہیں۔

ذبیحہ پر ہونے والے اعتراضات اور ان کا جائزہ:۔

اعتراض: بعض لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جانوروں کو ذبح کرنا درست عمل نہیں کیونکہ اس سے انہیں اذیت ہوتی ہے اور کسی بھی جاندار کو ایذاء پہنچانا قبیح ترین فعل ہے۔

شرعی جواب: تفسیرِ کبیر میں امام رازی اس شبہ کے جواب میں لکھتے ہیں جانور کو ذبح کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے اور جانور اللہ کی ملک ہیں اور مالک اپنی ملک میں جس طرح چاہے تصرف کرے یہ اس کا حق ہے، اس کو ظلم کہنا صحیح نہیں۔

یہ نظریہ کہ جانور کو ذبح کرنا عقلاً ممنوع ہے، اس فعل سے حیوانات کو اذیت پہنچتی ہے یہ میرے نزدیک باطل ہے۔ کیونکہ بعثت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم گوشت تناول فرماتے تھے اور آپ سے متعلق یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آپ مشرکین کا ذبیحہ کھاتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم خود جانور ذبح فرماتے تھے اور آپ کوئی ایسا فعل نہیں کر سکتے کہ جو عقلاً ممنوع ہو۔(19)

اور دوسرا جواب یہ کہ جانور ذبح کرنے سے غذا حاصل ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی منفعت ہے جو مقصود بالذات ہے اس لئے یہ ایک مباح کام ہے اللہ جل مجدہٗ نے فرمایا:

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۔(20)

وہی ہے جس نے زمین کی چیزوں کو تمہارے نفع کے لئے پیدا کیا لہٰذا اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے اگر جانور کو کچھ اذیت ہوتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں جس طرح فصد، حجامت اور آپریشن وغیرہ میں بظاہر انسان کو تکلیف پہنچتی ہے لیکن درحقیقت اسی میں اس کی صحت پوشیدہ ہے۔

سائنسی جواب: اسلامی طریقۂ ذبح پر اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں جانور پر ظلم کیا جاتا ہے اس لئے یہ ایک بے رحمانہ طریقہ ہے لیکن سائنسی تحقیق اس کے خلاف ہے۔

جرمن یونیورسٹی University Hanover کے پروفیسر Schultz اور ان کے ساتھ Dr. Hazem نے عملی تجربہ سے یہ ثابت کیا کہ اسلامی طریقۂ ذبح انتہائی رحمدلانہ ہے کیونکہ اس میں جانور کو کم سے کم تکلیف ہوتی ہے۔ جبکہ اس

کے برعکس مغربی ممالک میں کثرت سے رائج طریقۂ کار جو کہ Cap Bolt Stuning کہلاتا ہے اس میں جانور کو بہت زیادہ اذیت ہوتی ہے۔

اسٹننگ:۔

جانوروں کو ذبح کرنے سے پہلے بے ہوش کرنے کا عمل سٹننگ کہلاتا ہے۔

اس حوالے سے وہاں ایک تجربہ کیا گیا' یہ تجربہ 10 بچھڑوں اور 17 بھیڑوں پر کیا گیا اس کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔

1۔ سب سے پہلے تمام جانوروں کی کھوپڑیوں میں سرجری کر کے Electrodes اس طرح لگائے گئے کہ یہ دماغ کی سطح کو چھو رہے ہوں

2۔ اس کے بعد جانوروں کو روبہ صحت ہونے کے لئے کئی ہفتوں تک چھوڑ دیا گیا۔

3۔ اگلے مرحلے میں کچھ جانوروں کو تیز دھار چھری کے ذریعے شرعی طریقہ پر ذبح کیا گیا اور کچھ جانوروں کو کیپٹو بولٹ پسٹل کے ذریعے سٹن کر دیا گیا۔

4۔ اس پورے عمل کے دوران ECG اور EEG کے ذریعے ہر جانور کے دل و دماغ کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا بغور مشاہدہ کیا گیا۔

شرعی طریقے سے ذبح کرنے کے نتائج:

1۔ شرعی طریقہ سے ذبح کرنے کے بعد پہلے تین سیکنڈ کے دوران گراف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جس سے ظاہر ہوا کہ اس دوران یا فوراً بعد جانور کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

2۔ اگلے تین سیکنڈ میں EEG نے ایسی بے ہوشی ظاہر کی جیسی نیند کی وجہ سے ہوتی ہے یہ اس بات کی علامت تھی کہ خون بہت تیزی سے نکل رہا ہے۔

3۔ ان 6 سیکنڈ کے بعد EEG صفر پر تھا اور اس سے بھی یہی ظاہر ہوا کہ اس وقت جانور کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

4۔ جونہی EEG صفر پر آیا تو ابھی تک دل دھڑک رہا تھا اور جسم سکڑ رہا تھا جس کی وجہ سے جسم سے کافی تعداد میں خون کا

اخراج ہورہا تھا۔

(اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر جانور کے جسم میں ساراخون نکل جائے تو صارفین کو بیماریوں سے پاک صحت افزاء گوشت حاصل ہوتا ہے)

کیپٹو بولٹ اسٹننگ کے نتائج:

1۔ اسٹننگ کے فوراً بعد بظاہر جانور بے ہوش ہوجاتے ہیں

2۔ اسٹننگ کے فوراً بعدEEG سے بظاہر شدید تکلیف ظاہر ہورہی تھی۔

3۔ اسٹننگ کئے گئے جانوروں کے دل کی دھڑکن' شرعی طریقے سے ذبح کئے گئے جانوروں کے دل کی دھڑکن کے مقابلے میں پہلے رک گئی جس کے نتیجے میں جسم سے خون کا اخراج رُک گیا۔(اور ایسی صورت میں بیماریوں سے پاک گوشت کاحصول ممکن نہیں) (21)

غیرشرعی ذبیحہ کے نقصانات:

شرعی طریقے پر اگر جانور کو ذبح نہ کیا جائے تو نہ صرف اس جانور کا گوشت مختلف بیماریوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے بلکہ ریسرچ سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ ایسے جانوروں کے دماغ کے ٹشوز متاثر ہونے کے سبب سے پورے جسم میں جراثیم پھیل جاتے ہیں اور نتیجتاً یہ گوشت انسانی صحت کے لئے شدید ترین نقصان کا باعث بنتا ہے۔

ٹیکساس کی اے ایم یونیورسٹی اور کینیڈا کی فوڈ انسپکشن ایجنسی کی تحقیق کے مطابقPneumatic اسٹننگ سے اتنی زوردار ضرب لگتی ہے کہ دماغ کے ذرّات گائے کے پورے نظام میں پھیل جاتے ہیں حتی کہ پھیپھڑوں اور جگر میں بھی داخل ہوسکتے ہیں۔

اورخون کی چھوٹی چھوٹی رگیں اسٹننگ سے ذبیحہ میں پھٹ جاتی ہیں جس کے نتیجے میں خون گوشت میں سرایت کرجاتا ہے۔ (22)

اور اگر اسٹننگ کے علاوہ کسی اور طریقہ پر جانور کو ہلاک کرکے اس کا گوشت استعمال کیا جائے تو وہ بھی مضرِ صحت ہوگا کیونکہ سائنسی ریسرچ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اگر جانور کے پیٹ یا ٹانگوں کے ذریعے یا پھر گردن کے علاوہ کسی اور عضو بدن

سے ہلاک کیا جائے جیسے کہ بعض مشرکین اور دیگر مذاہب کے لوگ پیٹ چاک کر کے دل کو زور سے دباتے ہیں تاکہ جانور ہلاک ہو جائے۔ ان تمام طریقوں سے چونکہ جسم سے خون کا بہاؤ درست سمت میں نہیں ہوتا جس کی وجہ سے زہریلے مادے اور بیکٹیریا گوشت کے اندر ہی رہ جاتے ہیں اور انسان جب یہ گوشت استعمال کرتا ہے تو یہ زہریلے مادے اس کے جسم میں منتقل ہو کر مختلف بیماریوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اس لئے سائنسی طور پر بھی جانور کو بنا تکلیف دیئے بہترین اور صحت مند گوشت کا حصول صرف اور صرف ذبیحۂ شرعی کے ذریعے ہی ممکن ہے اور کیوں نہ ہو کہ یہی طریقہ خالقِ کائنات نے تعلیم فرمایا ہے۔

دیگر مذاہب اور اسلام کے طریقۂ ذبح کا تقابل:

ذکاۃِ شرعیہ ہی وہ واحد مضبوط اور منظّم طریق ہے جو کہ دینِ اسلام کو دیگر الہامی و غیر الہامی ادیان سے ممتاز کرتا ہے۔
دیگر ادیان خواہ وہ الہامی ہوں یا غیر الہامی ان میں سے اکثر قومیں ذبح اور قربانی جیسے مقدس فریضے کو مشرکانہ نقطۂ نظر سے کرتی آ رہی ہیں، لوگ دیوتاؤں اور بُتوں کے نام پر جانوروں کو چھوڑ دیتے اور غیر اللہ کے نام پر اور ان کی رضا کے حصول کے لئے جانوروں کو قربان کرنا ان کے یہاں عام سی بات تھی۔

جبکہ اس کے برعکس دینِ اسلام میں غیر اللہ کے نام پر ذبح شدہ جانور کو حرام قرار دیا گیا اور آقا کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام عقیدۂ توحید کو مسلمانوں کے دلوں میں راسخ کرنے کے لئے اپنے عمل سے ثابت کیا اور صحابۂ کرام علیہم الرضوان نے بھی اسی کی اتباع کی۔

تاریخ میں اگر ہم قومِ یہود کے عملِ ذبیحہ کو دیکھیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ جل مجدہٗ نے اپنی آخری کتاب قرآنِ مجید میں اہلِ کتاب کے ذبیحہ کو جائز قرار دیا ہے۔

وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ (23)

''اور اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے''

اہلِ کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی نبی پر ایمان رکھتے ہوں اور کسی آسمانی کتاب جیسے توریت، زبور و انجیل کا اقرار کرتے ہوں۔

علامہ شامی لکھتے ہیں کہ

والکتابی من یؤمن بنبی و یقرہ الکتاب ۔

اور اہلِ کتاب وہ ہیں جو نبی پر ایمان رکھتے ہوں اور کتاب پر بھی۔

معلوم ہوا کہ اگر یہودی و عیسائی اللہ کا نام لے کر ذبح کرتے ہیں اور منزل من اللہ کتابوں میں سے کسی کتاب پر ایمان رکھتے ہوں تو ان کا ذبیحہ حلال ہے لیکن تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ آج کل ایسے عیسائیوں کی تعداد بہت کم ہے جو کہ عہد نامۂ قدیم میں دی گئی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں اور شرعی طریقۂ ذبیحہ پر بھی کاربند ہیں۔ کیونکہ عہد نامۂ جدید سے حلت و حرمت کے ان احکامات کو نکال دیا گیا ہے اور اس میں تحریف کر کے نئی شریعت گڑھ لی ہے' اور ان میں سے اکثر دہریہ Ethist ہو چکے ہیں۔ اہلِ کتاب کے اسی طرزِ عمل کے سبب فقہائے کرام ان کے ذبیحے سے احتیاط کرنے کا حکم دیتے ہیں' لیکن اگر کوئی اہلِ کتاب کہلائے اور ذکاۃِ شرعیہ پر کاربند ہو تو اس کے ذبیحہ کو کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

حرفِ آخر:

جانوروں کو ذبح کرنے کا تصور تاریخِ انسانی کے ہر دور میں رہا ہے فرق صرف الہامی وغیر الہامی مذاہب کے درمیان ہے۔ الہامی مذاہب کا ذبیحہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے تابع رہا ہے۔ انبیاءؑ کی شرائع میں ذبح کے احکامات کے تحت ہی سابقہ امم جانوروں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو استعمال میں لایا کرتی تھیں اور دینِ اسلام میں بھی ذبیحہ کے واضح احکامات موجود ہیں

اہلِ ایمان کے نزدیک ذبیح سے مقصود تین چیزیں ہیں۔

1۔ گوشت کا حلال ہونا

2۔ بے ضرر ہونا

3۔ جانور کو تکلیف سے محفوظ کرنا

جبکہ وحی سے غیر منقطع نام نہاد مہذب معاشروں کا مقصد صحتمند گوشت کا حصول اور جانور کو تکلیف سے محفوظ رکھنا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ حلال ہے یا نہیں۔ اسی طرح غیر مہذب لوگوں کا مقصود فقط گوشت کا حصول ہے قطع نظر اس کے کہ جانور کو تکلیف ہوتی ہے یا نہیں۔

مراجع وحواشی:

(۱) سورۃ مائدہ، آیت 27

(۲) سورۃ حج، آیت 34

(۳) تفسیر خازن، امام علی بن محمد بن ابراھیم، جلد 3، ص 309، دارلکتب العلمیۃ بیروت

(۴) سورۃ کوثر، آیت 3

(۵) ابن ماجہ، امام محمد بن یزید ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 1045، مکتبہ قدیمی کتب خانہ

(۶) سورۃ الانعام، آیت 121

(۷) سورۃ الانعام، آیت 118

(۸) شرح صحیح مسلم للنووی، جلد 2، صفحہ 145، کتاب الصید ولذبائح مکتبۃ البشریٰ

(۹) سورۃ الانعام، آیت 146

(۱۰) سورۃ المائدہ، آیت 103

(۱۱) صحیح بخاری، امام محمد بن اسمٰعیل، رقم الحدیث 3541

(۱۲) تفسیر قرطبی، امام ابوعبداللہ محمد بن احمد، جلد 6، صفحہ 335، دارلکتب العلمیہ بیروت

(۱۳) سورۃ الانعام، آیت 145

(۱۴) صحیح بخاری، رقم الحدیث 3521

(۱۵) تفسیر قرطبی، جلد 6، صفحہ 121 ، دارلکتب العلمیہ بیروت

(۱۶) الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیہ، عبداللہ عبدالرحیم الہادی، مطبوعہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ

(۱۷) مشینی ذبیحہ کا حکم مذاہبِ اربعہ کی روشنی میں، مفتی نظام الدین رضوی، مطبوعہ مکتبہ برکاتِ المدینہ

(۱۸) مجلّہ فقہ اسلامی، شمارہ 25

(۱۹) تفسیرِ کبیر، فخر الدین ابن خطیب الرازی، جلد 3، صفحہ 253 ، دارلکتب العلمیۃ بیروت

(۲۰) سورۃ البقرۃ، آیت 29

(۲۱) مجلّہ ہفت روزہ بزنس اینڈ شریعہ، صفحہ 18

(۲۲) ایضاً، صفحہ 23

(۲۳) سورۃ المائدہ، آیت 5

اقبال کا تصّور اجتہاد.....تحقیقی جائزہ

تہمینہ پرویز*

کائنات جامد وساکن کے بجائے متحرک ہے زندگی کے احوال میں تغیر رونما ہوتا رہتا ہے اس لئے کسی بھی سماج کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ لازمی طور پر کچھ ایسے ابدی اصول رکھتا ہو جن پر وہ اپنی اجتماعی زندگی کو استوار کر سکے تا کہ اس مسلسل تغیر پذیر دنیا میں نہ بدلنے والے اصولوں کی وجہ سے قدم جمے رہیں اور اکھڑنے نہ پائیں۔لیکن یہ ابدی اور دائمی اصول اپنی اطلاقی صورت میں متحرک ہوں ان اصولوں کے اندر فطرتاً یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ تغیر زمانہ کے ساتھ پیش آنے والے مسائل کے حل میں معاونت کر سکیں۔ اسلام ثبات وتغیر دونوں کو بیک وقت اساسِ حیات سمجھتا ہے قرآن تغیرات وانقلاباتِ فطرت کو آیاتِ الٰہی کہتا ہے اسلام کی فطرت میں حرکت وتغیر ہے اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات اور ان کا حل تلاش کر سکے کیونکہ پیغمبر رسول ﷺ کی تعلیمات کل قیامت تک کے لئے آخری ہدایت کے طور پر موجود ہیں۔ اسلام میں اصول ِ اجتہاد ہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے اسلام کے ابدی اصولوں کو بدلتے ہوئے حالات پر منطبق کیا جا سکتا ہے، تغیر زمانہ کے ساتھ پیش آنے والے مسائل کے حل کے لئے ہر دور میں اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام کا یہی اصولِ اجتہاد اسے دیگر مذاہب سے اس طور پر ممیّز کرتا ہے کہ یہ ہر دور میں قابلِ عمل رہا۔کمال فاروقی اپنی کتاب اجتہاد اور بابِ اجتہاد میں لکھتے ہیں:

''اگر اسلامی نظام بے لچک اور جامد ہوتا تو عالمِ اسلامی میں بھی اختلافات کی ایسی ہی ناقابلِ عبور خلیج رونما ہو جاتی جیسے اشتراکی نظام میں اسٹائن ٹرائسکی کے پیروؤں کے مابین پیدا ہوگئی ہے خوش قسمتی سے اسلامی نظامِ کی تعمیر جس سنگ وفشک سے عمل میں آئی ہے وہ بہت پائیدار اور مضبوط ہے۔''(۱)

---

* ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک لرننگ، کراچی یونیورسٹی

اجتہاد کے معنی ومفہوم:

لغوی معنی:

اجتہاد کا مادہ ''جہد'' سے اور جہد کا معنی ہے قوت وطاقت، اجتہاد کا لغوی مفہوم کسی پر مشقت کام میں پوری طاقت صرف کرنا۔

ابن منظور افریقی (۷۱۱ھ) نے جہد اور اجتہاد کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

" الجُهد الجَهدالطاقة تقول: اجهد جهدک وقيل الجهد المشقة والجهد الطاقة والاجتهاد والتجاهد : بذل الوسع والمجهود " (لسان العرب ۱/۵۲۰ ۔ ۵۲۱)

(جُہد اور جَہد کے معنی طاقت کے ہیں آپ کہتے ہیں اجهد جهدک (اپنی پوری طاقت لگادو) ایک قول یہ ہے کہ جُہد کے معنی مشقت اور جَہد کے معنی طاقت ہے اجتہاد اور تجاہد پوری طاقت صرف کرنے کا نام ہے۔)

امام غزالی نے (۵۰۵ھ) المستصفی میں اس کی تعریف اس طرح لکھتے ہیں کہ

" هو عبارة عن بذل المجهود واستفراغ الوسع فی فعل من الافعال ولا يستعمل الا فيما فيه كلفةو جهد فيقال : اجتهد فی حمل حجر الرحا ولا يقال اجتهد فی حمل خردلة" (المستصفی ۲/۵۱۰)

اجتہاد کسی کام میں پوری کوشش صرف کرنے اور پوری توانائی لگانے کا نام ہے، اجتہاد کا استعمال اسی کام کے لئے ہوتا ہے جس میں مشقت اور کلفت ہو، کہا جاتا ہے: ''**اجتهد فی حمل حجر الرحا**'' (چکی کا پتھر اٹھانے کی پوری کوشش کی) یہ نہیں کہا جاتا: '' **اجتهد فی حمل خردلة**'' (رائی کا دانہ اٹھانے کی پوری کوشش کی) (۲)

اصطلاحی معنی:

اجتہاد کی اصطلاحی تعریف مختلف انداز میں کی جاتی ہے۔

☆ امام غزالی نے اجتہاد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

" بذل المجتهد وسعه فی طلب العلم باحكام الشريعة والاجتهاد التام ان يبذل الوسع فی الطلب بحيث يحس من نفسه العجز عن مزيد الطلب" (المستصفی ۲/۵۱۰)

اجتہاد، احکام شریعت کا علم حاصل کرنے میں مجتہد کا توانائی صرف کرنا ہے اور اجتہاد تام یہ ہے کہ طلب وجستجو میں اس قدر طاقت

لگائے جس سے زیادہ طلب وجستجو سے اپنے آپ کو عاجز سمجھتا ہو۔

☆ حضرت شاہ ولی اللہ محدث (۱۱۷۶ھ) نے اجتہاد کی تعریف یوں کی ہے

" حقیقة الاجتهاد علی ما یفهم من کلام العلماء استفراغ الجهد فی ادراک الاحکام الشریعة الفرعیةعن ادلتها التفصیلیة الراجعة کلیاتها الی اربعةاقسام الکتاب والسنة والاجماع والقیاس"(عقد الجید فی احکام الاجتهادوالتقلید ص ۳)

(علماء کے کلام سے اجتہاد کی حقیقت یہ سمجھ آتی ہے کہ اجتہاد فروعی شرعی احکام کو شریعت کے تفصیلی دلائل جو بنیادی طور پر چار ہیں: کتاب، سنت، اجماع ، قیاس سے جاننے کی پوری کوشش کرتا ہے)۔ (۳)

☆ علامہ اقبال نے اجتہاد کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے

'' اسلامی قانون کی اصطلاح میں ''ایسی کوشش ہے جو ایک قانونی مسئلہ پر'' آزادانہ رائے'' قائم کرنے سے عبارت ہے۔'' (۴)

آزادانہ رائے سے مراد کسی فرد کی مطلقاً آزادی رائے نہیں ہے۔ یہ ایک شرعی اصطلاح ہے، شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ

''حضرات صحابہ کرامؓ کو جب کسی معاملے میں قرآن وسنت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی تو وہ اجتہاد کر کے یعنی اس علت کو معلوم کرتے جس کی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے منصوصات سے احکام اخذ کئے۔ کسی حکم سے رسول اللہ ﷺ کی کیا غرض ہے اس کو معلوم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے اور اس کے موافقت میں ایک حکم کو دوسرے حکم پر منطبق کرتے۔'' (۵)

☆ مولانا جلال الدین عمری اپنی کتاب میں اجتہادی عمل کی وضاحت یوں کرتے ہیں

''یہ دیکھنا کہ کس شخص کے لئے کون سا حکم قابلِ برداشت ہے اور کب اس کے لئے زحمت اور دشواری پیدا ہو جائے گی ایک اجتہادی عمل ہے۔''(۶)

اجتہاد از روئے قرآن وحدیث:

اقبال کے نزدیک تصور اجتہاد کی بنیاد قرآن کی یہ آیت ہے جس میں مسلسل جدوجہد کرنے والوں کو اللہ زندگی کی نئی نئی راہیں دکھانے کا وعدہ کرتا ہے۔

والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا (۷)

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر غور وفکر کی تلقین کی گئی ہے اسی طرح حدیثِ مبارکہ میں بھی اجتہاد کی بڑی حوصلہ

افزائی موجود ہے۔حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

" اذاحکم الحاکم فاجتهد ثم اصاب فله اجران و اذا حکم فاجتهدثم اخطاء فله اجر" (۸)

''جب حاکم فیصلہ کرے اوراس کے لئے کوشش کرے اور امرِ حق پالے تو اسے دو اجر ہیں، جب حاکم فیصلہ کرے اوراس کے لئے کوشش کرے لیکن اس کے باوجود غلطی کر جائے تو اس کا ایک اجر ہے''

اسی طرح حضرت معاذ بن جبلؓ کی حدیث بھی اجتہاد پر دلالت کرتی ہے جس میں انھوں نے قرآن وحدیث سے کسی حکم کے نہ ملنے پر اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا کہا اور آپ ﷺ نے ان کو تحسین وآفرین کہی اور ہمیشہ کے لئے جدید قانون سازی کا راستہ صاف کر دیا۔

''حضرت معاذ بن جبلؓ کو رسول ﷺ نے یمن بھیجا تو ان سے پوچھا: جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ آئے تو فیصلہ کیسے کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا، آپ ﷺ نے دریافت کیا: اگر اللہ کی کتاب میں اس کا حل نہ ملے تو کیا کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا: اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا، آپ ﷺ نے پھر سوال کیا: اگر سنتِ رسول ﷺ میں بھی اس کا حل نہ پاؤ، تو کیا کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا: ''**اجتهد رائیی ولا آلو**'' مطلب یہ کہ کتاب وسنت کی روشنی میں قیاس کرنے اور رائے قائم کرنے کی پوری کوشش کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا، رسول اللہ ﷺ نے خوش ہو کر حضرت معاذؓ کے سینے پر دستِ مبارک رکھا اور فرمایا: خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول ﷺ کے قاصد کو ایسے رویہ کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول خوش ہے۔''(۹)

اجتہاد کے مدارج یا منازل:

علامہ اقبالؒ اجتہاد کی ہر دور میں ضرورت پر زور دیتے ہوئے اجتہاد کے تین مدارج کو بیان کرتے ہیں۔جنہیں تمام فقہی مکاتبِ فکر نے تسلیم کیا ہے:

۱۔ قانون سازی کا مکمل اختیار

۲۔ اضافی اختیار جس میں کسی مخصوص فقہ کے مکتب کے دائرہ کار میں رہ کر عمل کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ خصوصی اختیار جس کا تعلق کسی مخصوص معاملے سے ہے جو ائمہ فقہاء کی طرف سے بیان ہونے سے رہ گیا ہو۔ (۱۰)

ان مدارج کو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے رسالے عقد الجید فی احکام الاجتهاد والتقلید میں ان تین ناموں سے

بیان کیا ہے۔

۱۔ مجتہد مطلق ۲۔ مجتہد منتسب ۳۔ مجتہد مقلد (۱۱)

علامہ اقبالؒ نے اس خطبہ اجتہاد میں موضوع بحث اجتہاد کی پہلی قسم اجتہاد مطلق کو بنایا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''اہلِ سنت فطری طور پر اجتہاد کے امکان کو تسلیم کرتے ہیں مگر عملی طور پر فقہ کے مکاتب فکر کے قیام کے بعد سے اس کی کبھی بھی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ اجتہاد کی کامل آزادی کو یوں مشروط کر دیا گیا ہے کہ کسی فردِ واحد کا ان شرائط کو پورا کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔

اس طرح کا رویہ ایک ایسے قانون نظام کے پیشِ نظر عجیب لگتا ہے جس کا انحصار زیادہ تر قرآن پر ہو جو زندگی کے متحرک نقطۂ نظر کو لازم کر دیتا ہے۔'' (۱۲)

دور جدید کی ضرورت وتقاضے:

اقبال اجتہاد کو دور جدید کی ضرورت سمجھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''اسلام کے اس بنیادی نظریے کی رو سے اب کسی نئی وحی کی حجیت باقی نہیں رہی، ہمیں روحانی اعتبار سے دنیا کی سب سے زیادہ آزاد اور نجات یافتہ قوم ہونا چاہیے۔ قرون اولی کے مسلمان جنھوں نے قبل اسلام کے ایشیا کی غلامی سے نجات حاصل کی تھی اس حالت میں نہیں تھے کہ وہ اس بنیادی نظریے کی اصل معنویت جان سکیں۔ آج کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اس اہمیت کو سمجھیں۔ بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنی عمرانی زندگی کی از سرِ نو تشکیل کریں اور اسلام کے اس مقصد حقیقی کو حاصل کریں جس کی تفصیلات کا حال ہم پر پوری طرح واضح نہیں ہیں۔'' (۱۳)

اسی ضرورت کے پیشِ نظر مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ

''اب تجدید کا کام نئی اجتہادی قوت کا طالب ہے۔ محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحب یا ان سے پہلے مجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے اس وقت کے کام سے عہدہ برا ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ جاہلیت جدیدہ بے شمار مسائل کے ساتھ آئی ہے۔ اور اس نے بے حساب نئے مسائل زندگی پیدا کر دیئے ہیں۔ جن کا وہم تک شاہ صاحب اور دوسرے قدم کے ذہین میں نہ گزرا تھا۔ صرف اللہ جل جلالہ کے علم اور اس کی بخشش سے رسولؐ کی بصیرت ہی پر یہ حالات روشن

تھے۔لہذا کتاب اللہ اور سنت رسول ہی وہ تنہا ماخذ ہے۔جس سے اس دور میں تجدید ملت کا کام کرنے کے لیے راہ نمائی حاصل کی جا سکتی ہے اور اس راہ نمائی کو اخذ کر کے اس وقت کے حالات میں شاہراہ عمل تعمیر کرنے کے لیے ایسی مستقل قوت اجتہاد درکار ہے جو مجتہدین سلف میں سے کسی ایک کے علوم اور منہاج کی پابند نہ ہو۔اگرچہ استفادہ ہر ایک سے کرے اور پرہیز کسی سے نہ کرے۔''(۱۴)

علمائے کرام نے بدلتے ہوئے حالات میں نئے مسائل کے حل کے لئے اجتہاد کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔اس سلسلے میں جلال الدین عمری اپنی کتاب ''تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث'' میں لکھتے ہیں کہ

''ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ جب کوئی نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو۔اور اس بات کا اندیشہ پیدا ہو جائے کہ اجتہاد کے ذریعے صحیح راہ نہ دکھائے جانے پر لوگ شریعت سے ہٹ جائیں گے۔تو مجتہدین پر اجتہاد واجب ہے اگر وہ اس مسئلہ کو حل نہ بھی کر سکیں تو کوشش اور جدوجہد کرنا ان کے لیے ضروری ہے''(۱۵)

اقبال کے تصور اجتہاد کا تنقیدی جائزہ:

اقبالؒ تقلیدی رویئے پر تنقید اور اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''اب چونکہ صورتحال بدل چکی ہے اور عالم اسلام کو ان نئی قوتوں کی طرف سے آج نئے نئے مسائل و حوادث کا سامنا ہے جو انسانی فکر کے ہمہ جہت اور غیر معمولی ارتقاء کی آفریدہ ہیں۔لہذا اس قسم کے رویہ کے اپنائے جانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور نہ ہی ائمہ فقہ نے اپنے استدلال اور تعبیرات کی قطعیت کا کوئی دعویٰ کیا۔۔۔قرآن کی یہ تعلیم کہ زندگی ایک ارتقاء پذیر تخلیقی عمل ہے خود اس امر کا متقضی ہے کہ ہر نسل کو اپنے اجداد کی رہنمائی میں انھیں رکاوٹ سمجھے بغیر یہ اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مسائل خود حل کر سکے۔'' (۱۶)

علامہ اقبال کی اس بات کی وضاحت سید محمد جعفری اس طرح کرتے ہیں کہ

'' اقبال کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت لکھتے تھے اور انہوں نے ماضی کے بے جا احترام پر اپنے عہد کے تقاضوں کو قربان نہیں کیا امام ابوحنیفہؒ سے انسپریشن لیتے ہوئے اقبالؒ بھی لکھتے ہیں کہ اگر قوم کے زوال کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم اپنی گذشتہ تاریخ کو احترام کی نگاہ سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیاء خود ساختہ ذرائع سے کریں۔

ماضی کا غلط احترام اور اس طرح ضرورت سے زیادہ اجتماعی نظم اور جمود کا رجحان اسلام کی اندورنی روح کے خلاف ہے۔'' (۱۷)

علامہ اقبالؒ کی طرح مجیب اللہ ندوی بھی امام ابوحنیفہ کے طرز استنباط سے استدلال کرتے ہوئے موجودہ دور کے مسائل کے حل کے لئے ایسی ہی ایک ٹیم کی ضرورت پر زور دیتے ہیں کہ جس میں جدید تعلیم یافتہ اور علماءِ دین دونوں طرح کے لوگ شریک ہوں تا کہ جدید مسائل کا حل قرآن وسنت سے مستنبط کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ

''امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں بات معلوم ہے کہ قرآن وحدیث سے انھوں نے جتنے مسائل خاص طور پر معاملات کے سلسلے میں مستنبط کئے دوسرے فقہاء نے اتنے مسائل مستنبط نہیں کئے۔ اور اسکی ایک وجہ تو تذکرہ نگار یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ خود ایک بڑے تاجر تھے اسلئے وہ معاملات میں حالات کے لحاظ سے جو ردوبدل ہوتے رہتے تھے اس سے براہِ راست واقف تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کا استنباط شورائی ہوتا تھا۔ جب کوئی نیا مسئلہ یا کوئی نئی صورت پیش آتی تھی تو وہ اسے اپنی مجلس میں تلامذہ کے سامنے پیش کرتے تھے اور سارے تلامذہ اس کے بارے میں دلائل اور رائے دیتے تھے پھر بحث ومباحث کے بعد امام ابوحنیفہؒ اپنا فیصلہ دیتے تھے اسی طرح ان کے شاگرد امام ابو یوسف کی رائے عدلیہ کے سلسلے میں زیادہ وزنی سمجھی جاتی ہے اس لیے کہ وہ خود خلافت عباسیہ میں قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس رہ چکے تھے امام صاحب کے دوسرے شاگرد امام محمد کے بارے میں تذکروں میں آتا ہے کہ وہ جب بازار اور پیشہ وروں کے معاملات کے بارے میں کوئی مسئلہ مستنبط کرتے تھے تو پہلے بازار جا کر اس پیشے یا معاملے سے متعلق افراد سے مل کر اس کے ردوبدل اور عرف ورواج کو معلوم کرتے تھے پھر اس سلسلے میں اپنی کوئی شرعی رائے دیتے تھے آج بھی ضرورت ایک ایسی ہی ٹیم کی ہے جس میں دونوں طرح کے لوگ شریک ہوں میں معذرت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ افراد اپنی حد یہ مقرر کر لیں کہ وہ زندگی کے عرف عادات حالات کی ناسازگاری اور عموم بلویٰ قسم کی پیچیدہ سیاسی ومعاشی معلومات فراہم کر کے مجلس میں پیش کریں اور علماء بحث ومباحثہ کے بعد اس سلسلے میں اپنی شرعی رائے دیں تو اس طرح آسانی سے کسی مسئلے میں اجتہاد کی صورت پیدا ہو جائے گی مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں طبقے اپنے احساس برتری کو بالائے طاق رکھ دیں اگر یہ حد مقرر نہیں ہوگی تو دونوں اپنی جگہ پر فتوے دیتے رہیں گے اور قوم ذہنی انتشار کا شکار ہوتی رہے گی۔'' (۱۸)

اسی طرح علامہ اقبالؒ ایک اور جگہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اہل سنت اجتہادِ مطلق کے امکان کی نفی نہیں کرتے لیکن اقبالؒ کو اعتراض اس بات پر ہے کہ اجتہادِ مطلق کے لئے اس قدر شرائط لگا دی ہیں کہ ان شرائط پر پورا اترنا ناممکن

ہی نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''اہل سنت نظری طور پر اس درجے (مطلق) اجتہاد کے امکان کو تسلیم کرتے ہیں مگر عملی طور پر فقہ کے مکاتب فکر کے قیام کے بعد سے اسکی کبھی اجازت بھی نہیں دی گئی کیونکہ اجتہاد کی کامل آزادی کو یوں مشروط کر دیا گیا ہے کہ کسی فرد واحد کا ان شرائط کو پورا کرنا قریب قریب ناممکن ہے''(۱۹)

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؒ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اجتہاد پر کبھی نظری اعتبار سے پابندی نہیں لگائی گئی اور نہ ہی آئمہ اربعہ نے اپنے استدلال کی قطعیت کا کبھی دعوی کیا۔ علماء اہل سنت کی کتابوں میں بھی ہمیں یہی ملتا ہے کہ کسی بھی شخص کا اجتہاد حرفِ آخر نہیں ہے اور نہ ہی کبھی مسائل کے حل کے لئے علماء نے اجتہادی کوششوں سے انکار کیا جیسا کہ جلال الدین عمریؒ لکھتے ہیں

''اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی شخص کا اجتہاد کتاب وسنت کا قائم نظام نہیں ہے۔ اس لیے وہ حرفِ آخر بھی نہیں ہے کسی اجتہاد کو آخری حیثیت دے دی جائے تو اجتہاد کا عمل آگے نہیں بڑھ سکتا۔''(۲۰)

اسی طرح ہدایہ یا فتاوی عالمگیری کے فقہی فیصلوں کے بارے میں مرحوم مفتی شفیع عثمانیؒ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ

''ان تالیفات اور مجموعوں میں جو فیصلے درج ہیں۔ ان میں سے بعض کو نظر انداز یا منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ یا دوسرے فیصلوں کو ان کی جگہ دی جا سکتی ہے۔''(۲۱)

اسی طرح مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی چوتھی صدی کے بعد اجتہاد موقوف ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

'' چوتھی صدی کے بعد اجتہاد ختم ہو جانے کا یہ معنی نہیں کہ چار سو برس کے بعد کسی کو اجتہاد کے قابل دماغ نہیں ملا کیوں کہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ علاوہ ازیں یہ مطلق صحیح بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ ہر زمانہ میں ہزاروں اسی جزئیات نئی نئی پیش آتی ہیں جن کا کوئی حکم آئمہ مجتہدین سے منقول نہیں اور علماء خود اجتہاد کر کے اس کا جواب بتلاتے ہیں۔ پس اگر اجتہاد کا باب بالکل بند ہو گیا ہے اور اب کسی کا دماغ اجتہاد کے قابل نہیں ہو سکتا تو کیا ایسے نئے نئے مسائل کا جواب شریعت سے نہیں ملے گا یا ان مسائل کے جواب کے لیے کوئی نیا نبی آسمان سے اترے گا؟ قرآن مجید کی اس آیت " الیوم اکملت لکم دینکم سے معلوم ہوتا کہ دین کی تکمیل ہو چکی دروازہ اجتہاد بند کر دیا جائے تو پھر شریعت کی تکمیل کس طرح مانی جائے گی کیوں کہ ظاہر ہے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ ان کا جواب کتب فقہ میں مذکور نہیں نہ آئمہ مجتہدین سے کہیں منقول

ہیں ،فقہاء رحمہ اللہ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ چار سو برس کے بعد اجتہاد بالکل بند ہو گیا لیکن یہ ہے کہ اجتہاد فی الاصول کا دروازہ بند ہو گیا اور اجتہاد فی الفروع اب باقی ہے اور قیامت تک رہے گا(۲۲)

عتیق احمد بستوی بھی اپنی کتاب ''اجتہاد اور کارِ اجتہاد'' میں آخری دور کے علماء ہند کی اجتہادی کوششیں بیان کرتے ہیں کہ

''ادھر سو سال کے اندر خود ہندوستان کے ممتاز فقہاء اور اصحاب افتاء نے سینکڑوں ہزاروں نئے مسائل کا شرعی حل تلاش کرنے کی جو گراں قدر خدمت انجام دی اسے اجتہاد و استنباط کے سوا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔مولانا رشید احمد گنگوہی ،مولانا اشرف علی تھانوی ،مفتی کفایت اللہ ،مفتی محمد شفیع وغیرہم کے فتاوی اور فقہی تصنیفات و رسائل میں ایسے ہزاروں جدید مسائل پر کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں بحث کی گئی ہے جن کا قدیم فقہاء کے سراغ نہیں ملتا۔یہ مسائل بالکل نئے تھے صنعتی اور سائنسی ترقیات اور تبدیلیوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے تھے۔ان حضرات نے بیسویں صدی کے مذکورہ بالا مسائل سے یہ کہہ کر دامن نہیں جھاڑا کہ یہ بالکل نئے مسائل ہیں قدیم فقہی ذخیرہ میں انکا جواب نہیں ملتا اس لئے ہم ان کا کوئی شرعی حل تلاش کرنے سے معذور ہیں کیونکہ بالکل نئے مسائل کا حکم دریافت کرنے کے لئے کم از کم طبقہ سوم (مجتہد فی مسائل) کا عالم وفقیہہ ہونا ضروری ہے اور ہم طبقہ سوم میں تو کیا شمار ہوتے طبقہ ششم میں بھی جگہ پانے کے لائق نہیں ہیں۔تواضع کی آڑ میں گریز وفرار کی راہ اختیار کرنے کے بجائے ہمارے فقہاء اور اصحاب افتاء نے نئے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا راستہ اپنایا۔اپنی فکری اور اجتہادی صلاحیتوں سے کام لے کر نئے مسائل کا شرعی حل مصادر شریعت کی روشنی میں ڈھونڈ نکالا اور نئے حالات میں امت مسلمہ کی رہنمائی کا فریضہ خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔''(۲۳)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ علماء نے کبھی اجتہاد کی ضرورت سے انکار نہیں کیا تو مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اجتہاد کی کامل آزادی کو یوں مشروط کر دیا گیا ہے کہ کسی فرد واحد کا ان شرائط کو پورا کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔تو ان شرائط کا جائزہ لیتے ہیں کہ وہ شرائط کیا ہیں؟

اصول اجتہاد کا جائزہ:

جو اجتہادی اصول آج سے ہزار سال پہلے بنائے گئے تھے وہ صرف اس بناء پر رد نہیں کیے جا سکتے کہ وہ ہزار سال پرانے ہیں معقولیت کے ساتھ جائزہ لے کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ اصول کیا ہیں؟ اور کیا اس صدی میں ان کے سوا کچھ اور

اصول بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟؟؟

(۱) آدمی اس زبان اور اسکے قواعد، محاوروں اور ادبی نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو جسمیں قرآن نازل ہوا ہے۔

کیا یہ اصول آج کے دور کے لحاظ سے غلط ہے؟ انگریزی زبان میں قانون کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعبیر کا حق کسی ایسے شخص کو دیا جا سکتا ہے جو انگریزی زبان کی ایسی واقفیت رکھتا ہو؟ وہاں تو کاما کے ادھر سے ادھر ہو جانے سے معنی میں عظیم فرق پیدا ہو جاتا ہے؟ حتیٰ کہ بسا اوقات ایک کاما کی تبدیلی کے لیے پارلیمنٹ کو ایک قانون (Act) پاس کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہاں یہ مطالبہ ہے کہ قرآن کی وہ لوگ تعبیر کریں گے جو ترجموں کی مدد سے قرآن سمجھتے ہوں۔

(۲) آدمی نے قرآن مجید اور ان حالات کا جن میں قرآن نازل ہوا ہے گہرا اور وسیع مطالعہ کیا ہو۔

کیا اس اصول میں کوئی غلطی ہے؟ کیا موجودہ قوانین کی تعبیر کا حق کسی ایسے شخص کو دیا جا سکتا ہے جس نے قانون کی کسی کتاب کا محض سرسری مطالعہ کر لیا ہو یا اسکا محض ترجمہ پڑھ لیا ہو۔

(۳) آدمی اس عمل درآمد سے اچھی طرح واقف ہو جو رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی قوانین پر ہوا ہے۔

ظاہر بات ہے قرآن خلاء میں سفر کرتا ہوا براہِ راست ہم تک نہیں پہنچ گیا اس کو خدا کی طرف سے ایک نبی لایا تھا اس نبی نے اس کی بنیاد پر افراد تیار کیے تھے معاشرہ بنایا تھا ریاست قائم کی ہزارہ آدمیوں کو اسکی تعلیم دی تھی اور اس کے مطابق کام کرنے کی تربیت دی تھی۔ ان تمام باتوں کو آخر کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کا جو ریکارڈ موجود ہے اس سے آنکھیں بند کر کے صرف قرآن سے احکام کے الفاظ نکال لینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ (۲۴)

مسائل قدیم ہوں یا جدید ان کے حل کے لئے قرآن وحدیث ہی اصل سرچشمہ ہیں ان سے ہی صحابہ کرامؓ نے استفادہ کر کے اجتہاد کیا اب اس علمی سرمائے کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سعید احمد پالن لکھتے ہیں کہ

''ہمارا ایمان ہے کہ اسلامی فکر کا اصل سرچشمہ قرآن کریم اور حدیث نبویہ ﷺ ہیں ان میں جو فکر بسیط انداز میں بیان کی گئی ہے اسے ہی علمی اور فنی حیثیت سے سامنے لانا چاہیے ہمارا دخل اس میں تعبیر کی حد تک تو گوارا ہو سکتا ہے مگر اس میں ہماری فکری دخل اندازی کسی طرح برداشت نہیں کی جا سکتی اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب کہ فہم قرآن وحدیث کے اصول موضوعہ سے صرف نظر کی جائے۔ اگر کوئی ذیلی اجتہاد ناگزیر ہو تو وہ بھی اسی دائرے میں رہ کر کیا جائے۔ ایسا اجتہاد جس سے فکر

اسلامی کی پچھلی ساری بساط الٹ جائے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔اجتہاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے کیوں کہ ایسا کرنے ہی سے نئے مجتہدات اصل سرچشمے سے منسلک ہو سکتے ہیں'' (۲۵)

یہاں یہ بیان امر محتاج نہیں کہ اجتہاد کا یہ شرف صرف انہی بزرگان کے حصے میں آیا جنہیں خدا نے حکمت و دانش سے نوازا تھا اور قرآن فہمی کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا چنانچہ صحابہ کرامؓ نے نہ صرف سیاست اور معیشت کے مسائل میں اجتہاد فرمایا اور نئے تجربے کئے بلکہ ان مسائل میں بھی اجتہاد فرمایا جن میں قرآن و سنت اپنا فیصلہ دے چکے تھے لیکن جدید وقت کے تقاضوں کے پیش نظر صحابہؓ نے نصوص کی تشریح و تاویل میں حق و صداقت کی نئی نئی جہتوں کو دریافت کیا (۲۶) جبکہ خود علامہ اقبال نے اعتراف کیا ہے کہ

''زندگی اپنے ہی ماضی کے دباؤ کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور یہ کہ سماجی زندگی کے کسی بھی نظریے کی رو سے قدامت پسندی کی قوتوں کی قدر اور انکے عمل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا'' (۲۷)

تو پھر دورِ جدید کے مسائل میں اجتہاد کے لئے صحابہ کرامؓ اور آئمہ مجتہدین کے اجتہادات کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

(۴) آدمی اسلامی قانون کی پچھلی تاریخ سے واقف ہو وہ یہ جانتا ہو کہ یہ قانون کس طرح ارتقاء کرتا ہوا آج ہم تک پہنچا ہے۔پچھلی تیرہ صدیوں میں صدی بہ صدی اس پر کیا کام ہوا ہے اور مختلف زمانوں میں وقت کے حالات پر قرآن و سنت کے احکام مرتب کئے جاتے رہے ہیں۔اس تاریخ اور اس کام سے واقف ہوئے بغیر اجتہاد کر کے ہم اسلامی قانون کے ارتقاء کا تسلسل آخر کس طرح برقرار رکھ سکتے ہیں؟

ایک نسل اگر یہ طے کر لے کہ پچھلی نسلوں کے کئے سارے کاموں کو چھوڑ دے گی اور نئے سرے سے اپنی عمارت بنائے گی تو ایسا ہی فیصلہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں بھی کر سکتی ہیں۔ایک دانش مند قوم اپنے اسلاف کے کئے ہوئے کام کو برباد نہیں کرتی بلکہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے اسکو لے کر آگے وہ کام کرتی ہے جو انہوں نے نہیں کیا ہوتا اور اسطرح مسلسل ترقی جاری رہتی ہے۔

(۵) آدمی ایمانداری کے ساتھ اسلامی اقدار اور طرزِ فکر اور اللہ اور اسکے رسول اللہ ﷺ کے احکام کی صحت کا معتقد ہو۔اور رہنمائی کے لئے اسلام سے باہر نہ دیکھے بلکہ اسلام کے اندر ہی سے رہنمائی حاصل کرے۔یہ شرط ایسی ہے کہ دنیا کا ہر قانون اپنے اندر اجتہاد کرنے کے لئے لازمی طور پر لگائے گا۔

درحقیقت اجتہاد کے یہی پانچ اصول ہیں اگر کوئی صاحب معقول دلیل سے اس صدی کے لئے کچھ اور اصول تجویز کر سکے تو ہم ان کے ممنون احسان ہوں گے۔(۲۸)

مندرجہ بالا شرائط پر اگر غور کیا جائے تو ان کی معقولیت خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ اجتہاد جیسی اہم ذمہ داری کے لئے یہ انتہائی ناگزیر ہیں۔

اقبالؒ کے اس اعتراض ''کسی فرد واحد کا ان شرائط کو پورا کرنا قریب قریب ناممکن ہے'' کے جواب میں محمود عبدالقیوم ھزاروی لکھتے ہیں کہ

''تاہم شرائط کا فقدان ہے تو ان کو غیر ضروری قرار دینے کا بھی کوئی جواز نہیں اور نہ ہی ان کو کالعدم قرار دینے کی ضرورت ہے اس وقت شوق اجتہاد کی ضرورت نہیں بلکہ مسائل کے حل کی ضرورت ہے۔''(۲۹)

اسی طرح ان شرائط کے بارے میں مرحوم مفتی شفیع عثمانیؒ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ

''یہ صحیح ہے کہ محولہ بالا آیت قرآنی (سورہ نساء آیت ۱۱۵) اور حدیث (لا تجمع ۔۔۔۔) دونوں بحیثیت مجموعی کسی خا ص گروہ یا طبقہ کو نہیں بلکہ ساری امت کو اجماع کا حق عطا کرتی ہیں لیکن ایسے تمام امور میں جن میں کسی خاص علم وفن کی مہارت یا اعلیٰ درجہ کی علمی قابلیت درکار ہو عام لوگ ہمیشہ ماہرین کی رائے اور مشورہ کے محتاج ہوتے ہیں چنانچہ ریاضی، طب اور دوسر ے علوم وفنون میں ایسا ہی ہوتا ہے اجماعی فیصلہ خواہ کسی نوعیت کا ہو ہمیشہ قرآن وسنت سے ایک خاص قانونی فہم کی بناء پر جس میں حد درجہ احتیاط ملحوظ رکھی جاتی ہے مستنبط کیا جاتا ہے اور یہ کام صرف ایسے لوگوں کے ذریعے انجام پا سکتا ہے جو اس شعبہ علم کے ماہر ہوں۔ استدلال کے طور پر اس امر کو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خواہ مسئلہ زیر بحث کوئی بھی ہو اگر امت کا سواد اعظم فقہاء کے اجماع کا مخالف ہو تو کوئی اجماع اصطلاحی معنوں میں پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا لیکن یہ امکان ساری اسلامی تاریخ میں کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ عملاً اس کا وقوع ناممکن ہی ہے کیوں کہ اجماع ایک اسلامی فنی اور فقہی عمل ہے جس کے لیے امت مسلمہ کو ہمیشہ ان اہل علم پر اعتماد کرنا ہوگا جو اس شعبہ میں ضروری قابلیت اور اختصاصی مہارت رکھتے ہوں۔''(۳۰)

اجتہادِ مطلق پر کام کرنے کی ضرورت کیوں نہیں؟؟؟

علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں ''اجتہاد (قیاس) کے دروازے کا مقفل ہو جانا محض ایک افسانہ ہے جو کچھ تو اسلام کے فقہی فکر

کے ایک مخصوص قالب میں ڈھل جانے اور کچھ اس فکری کاہلی ہو جانے کا سبب گھڑا گیا جو خاص طور پر روحانی زوال کے دور میں ممتاز مفکرین کو بتوں میں تحویل کر دیتی ہے اگر بعد کے کچھ مسلم فقہاء نے اس افسانہ طرازی کو باقی رکھا ہے تو جدید اسلام اس بات کا پابند نہیں ہوگا کہ وہ اپنی ذہنی اور عقلی خود مختاری سے رضا کارانہ طور پر دست بردار ہو جائے'' (۳۱)

اس اقتباس کی روشنی میں یہاں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آیا اجتہادِ مطلق پر کام نہ کرنے کی وجہ اسکی ضرورت کا نہ ہونا ہے یا جدید نسل کو عقلی خود مختاری سے دستبردار کرنا ہے؟؟؟؟

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمود غازی لکھتے ہیں کہ'' تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے زمانے میں فقہائے اسلام کے سامنے بنیادی کام یہ تھا کہ قرآن وسنت کے احکام کی تعبیر کرنے کے اصول وضع کریں اور یہ بتائیں کہ قرآن وسنت سے احکام کیسے نکالے جائیں۔قرآن وسنت کے کسی حکم میں تعارض ہو تو اس کو کیسے دور کیا جائے یعنی ابتدائی دور کے فقہائے اسلام کو تعبیر شریعت،فہم شریعت اور تطبیقِ شریعت سے متعلق بنیادی سوالات کے جوابات دینے تھے،دوسری طرف اسلامی ریاست کی پھیلی ہوئی حدود اور اسلامی معاشرہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیشِ نظر جو مسائل سامنے آرہے تھے انکا جواب تلاش کرنا دوسرا بڑا اہم کام تھا جو انھوں نے کیا۔

اب پہلے کام کی تکمیل تو دوسری اور تیسری ہجری میں ہوگئی اب اس سطح پر کام کرنے کی ضرورت نہیں اگر کوئی شخص دوبارہ اسی سطح پر یہی کام کرے گا تو اسی نتیجے پر پہنچے گا جس پر یہ حضرات پہلے پہنچ چکے ہیں۔مثلاً ایک مسئلہ یہ آیا کہ خبر واحد واجب التعمیل ہے کہ نہیں۔کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ واجب التعمیل نہیں اس پر عمل درآمد نہیں ہوگا۔امام شافعی نے کتاب الرسالہ میں کوئی ستر پچھتر دلائل دیئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ خبر واحد واجب التعمیل ہے۔امام ابو حنیفہ نے بھی کہا کہ خبر واحد واجب التعمیل ہے۔اسی طرح امام مالک نے بھی خبر واحد کو واجب التعمیل قرار دیا ہے۔اسکے بعد خبر واحد کا واجب التعمیل ہونا طے ہو گیا۔اب اگر کوئی شخص اس مسئلہ پر اجتہاد کرے گا تو کیا کہے گا؟ یہی کہے گا کہ خبر واحد واجب التعمیل ہے یا کہے گا کہ واجب التعمیل نہیں ہے۔اگر وہ اپنے از سرِ نو اجتہاد کے نتیجے میں یہ رائے قائم کریں کہ خبر واحد واجب التعمیل نہیں ہے تو پھر سوال ہوگا کہ بالکل سرے سے ہی واجب التعمیل نہیں ہے یا بعض حالات میں واجب التعمیل ہے اور بعض میں نہیں ہے۔یہ کسی نے نہیں کہا کہ خبرِ واحد سرے سے واجب التعمیل نہیں ہے۔نعوذ باللہ کون مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد واجب التعمیل نہیں ہے۔واجب التعمیل بعض حالات میں ہے اور بعض میں نہیں ہے۔جن حالات میں واجب التعمیل ہے انکی نشان

دہی بعض فقہاء نے کی، اور جن حالات میں نہیں ہے اس کی بھی نشاندہی کر دی۔ اب اگر آج کوئی اس مسئلے پر اجتہاد کرے گا تو ان تینوں میں سے ہی کوئی نقطہ نظر اختیار کرے گا۔ یہ تینوں نقطہ نظر پہلے ہی اختیار کئے جا چکے ہیں۔

اسی طرح ایک سوال یہ پیدا ہوا کہ قرآن پاک میں صیغہ امر کے تحت جو احکامات آئے ہیں کہ یہ اور یہ کام کرو، وہ کیا وجوب کے لئے ہیں، کیا جائز ثابت کرنے یا مندوب اور مستحب ثابت کرنے کے لئے ہیں۔ جہاں احکام کا ذکر ہے تو یہ تین ہی شکلیں ممکن ہیں۔ چوتھی کوئی صورت تو ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ قرآن مجید میں کوئی حکم صیغہ امر میں دیا گیا ہو اور اس سے فعل کی حرمت یا کراہیت مراد ہو۔ ایسی بات تو کوئی بھی نہیں کہے گا۔ جو بقیہ صورتیں ممکن ہیں تو وہ تینوں کہی جا چکی ہیں اور دلائل بھی بیان ہو چکے ہیں۔ اب جو آدمی اجتہاد کرے گا تو ان تینوں میں سے کوئی ایک بات کرے گا جو پہلے ہی کہی جا چکی ہیں۔ تو یہ ساری مشق محض تحصیل حاصل ہے۔ نئی بات کہے گا تو وہ بات قابلِ قبول نہیں ہوگی اس لئے کہ عربی زبان اس کی متحمل نہیں۔ انسانی عقل اسکی اجازت نہیں دے گی کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ کام کرو اور آپ کہیں کہ یہ نہ کرنے کا حکم ہے۔

اس طرح بنیادی مسائل طے ہو چکے ہیں اب انکو دوبارہ کھولنے re-open کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جزوی مسائل امت کو پیش آتے رہیں گے۔ جب تک انسان موجود ہے اور جب تک مسلمان موجود ہیں تو لامتناہی جزوی مسائل پیش آتے رہیں گے۔ ان میں اجتہاد بھی ہوتا رہے گا۔ گویا اجتہاد کی یہ سطحیں اتنی بدیہی ہیں جو ہر ایک کو نظر آ سکتی ہیں۔ (۳۲)

پہلی سطح پر کام کرنے کی ضرورت نہ رہنے سے مراد ہے کہ اب اسکی ضرورت نہیں رہی اس لئے کہ جو کام اجتہاد مطلق کے ذریعہ کرنا مطلوب تھا وہ سارا کیا جا چکا اب دوبارہ اجتہادِ مطلق کی مشق کرنا انگریزی محاورہ کے مطابق پہیہ دوبارہ ایجاد کرنے کے مترادف ہے (۳۳)

اجتہاد احتیاط کا متقاضی:

اجتہاد کا دروازہ کھولنے سے کسی ایسے شخص کو انکار نہیں ہو سکتا جو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں ایک اسلامی نظام چلانے کے لئے اجتہاد کی اہمیت وضرورت کو اچھی طرح سمجھتا ہو لیکن اجتہاد کا دروازہ کھولنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی احتیاط کا متقاضی بھی ہے۔ یہ اپنے ساتھ خطرہ بھی رکھتا ہے جس کا اعتراف خود علامہ اقبال بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں

''اسلام میں آزاد خیالی کا ظہور تاریخِ اسلام کا ایک نازک لمحہ بھی ہے۔ لبرل ازم میں یہ رجحان موجود ہے کہ یہ

انتشار کی قوتوں کو فروغ دے۔۔۔مزید اس بات کا امکان ہے کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی مصلح لبرل ازم کے نہ رکنے والے جوش میں اصلاحات کی مناسب حدود کو بھی پار نہ کر جائیں''۔ (۳۴)

وحیدالدین بھی اس کام کی حساسیت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''عصر حاضر میں اسلامی فکر کی تشکیل نو کا کام جتنا ضروری ہے۔اتنا ہی زیادہ مشکل بھی ہے یہ ایک ایسا کام ہے جس میں ایک طرف اگر عصر حاضر کا گہرا مطالعہ ضروری ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ آدمی کو اسلام کی تعلیمات اور اس کی روح سے کامل درجہ کی واقفیت حاصل ہو۔اس دوطرفہ شرط میں ادنی سی کمی بھی بھیانک غلطی تک پہچانے کا سبب بن سکتی ہے''(۳۵)

اگرچہ وحیدالدین خود اجتہاد کی اہمیت کو سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس بات پر مصر ہیں کہ ان شرائط کو ختم کرکے اجتہاد کا دروازہ ہر کس وناکس کے لئے کھول دیا جائے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ

''اس میں بلاشبہ اندیشہ ہے کہ کچھ لوگ نااہلی کے باوجود اجتہاد کریں گے مگر ایسے لوگوں کا چیک کسی بھی قاعدہ اور ضابطہ کے ذریعے ممکن نہیں ایسے نااہل مجتہدین ہر دور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور آئندہ بھی وہ پیدا ہوتے رہیں گے ان کے خلاف چیک خدا کا یہ قانون ہے کہ اس دنیا میں صرف حق کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور باطل اپنی موت آپ مرکر ختم ہو جاتا ہے اس لئے ہمیں چاہئے کہ غیر ضروری طور پر مصنوعی پابندیاں وضع کرنے کے بجائے خدا کی ابدی سنت پر اعتماد کریں یہی ممکن ہے اور یہی مطلوب بھی۔''(۳۶)

لیکن صرف اس مفروضے کی بنیاد پر اجتہاد جیسی اہم ذمہ داری کا دروازہ نااہل افراد کے لئے نہیں کھولا جا سکتا۔محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ

'' اس میں احتیاط اس لئے ضروری بھی ہے کہ اگر اجتہاد کا دروازہ چوپٹ کھول دیا جائے گا اور ہر شخص اس میں داخل ہونے لگے تو پھر شریعت کے معاملات مذاق بن جائیں گے شریعت کا معاملہ کم علموں کے درمیان آجائے گا اور اس سے امت مسلمہ میں کنفیوژن اور التباس پھیلے گا کم نظر عالموں کے اجتہاد کے مقابلے میں بہتر یہ ہے کہ جو پچھلے قابلِ اعتماد بزرگ گذرے ہیں ان کے اجتہاد پر بھروسہ کیا جائے اس لئے فقہائے اسلام نے اجتہاد کے بارے میں کچھ شرائط عائد کی ہیں جن کی پابندی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور حدود کے اندر رہتے ہوئے اجتہاد کیا جائے۔(۳۷) البتہ نئے پیش آمد مسائل میں اجتہاد آج بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔کیونکہ آپ ﷺ نے نہ صرف اس کی اجازت دی بلکہ یہ آپ ﷺ کی وصیت بھی ہے

(کیونکہ اس کے بعد حضرت معاذؓ کی آپ ﷺ سے ملاقات نہیں ہوئی) اور آپ ﷺ کی وصیت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔'' (۳۸)

خلاصہ بحث:

اسلام مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے ہر دور کے لئے قابلِ عمل ہے اس کے بتائے گئے اصول آج کے جدید دور میں بھی اتنے ہی قابلِ عمل ہیں جتنا بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت تھے۔ بدلتے ہوئے حالات میں نئے پیش آنے والے مسائل کے حل لئے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجود اجتہاد کی اجازت بھی ہر کسی کو نہیں دی جا سکتی جیسا کہ اقبالؒ اپنے خطبہ اجتہاد میں شاعر ضیاء کی اصطلاحات کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کیا ایک شاعر شرعی قوانین کو فکرِ جدید کے نام پر از سرِ نو تعمیر کر سکتا ہے؟؟؟

پروفیسر کرار حسین علامہ کی اسی فکر اجتہاد سے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہیں کہ

''دراصل اقبال نے اجتہاد کے معنوں کو بہت وسیع کر دیا ہے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہر انسان کی فکر اجتہاد ہے اور ہر فرد اجتہاد کر سکتا ہے'' (۳۹)

حالانکہ اقبال کو اس کے نقصانات کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا انہوں نے اس فطری آزادی کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ایک اہم خطرہ کی نشاندہی بھی کی۔ وہ اپنے خطبہ اجتہاد میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''ہم جدید اسلام میں حریتِ فکر اور آزاد خیالی کی تحریک کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتے ہیں مگر اس بات کو بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ اسلام میں آزاد خیالی کا ظہور تاریخِ اسلام کا ایک نازک لمحہ بھی ہے۔ لبرل ازم میں یہ رجحان موجود ہے کہ یہ انتشار کی قوتوں کو فروغ دے''۔ (۴۰)

اس کے ساتھ اس جدوجہد میں انتشار اور نسل پرستی کے ساتھ ساتھ ایک اور خطرہ سے بھی آگاہ کیا کہ:

''مزید اس بات کا امکان ہے کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی مصلح لبرل ازم کے نہ رکنے والے جوش میں اصلاحات کی مناسب حدود کو بھی پار نہ کر جائیں''۔ (۴۱)

اگرچہ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ اجتہاد میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ اور ان کے فکری جمود کو توڑنے کے لئے اجتہادِ

مطلق کی ضرورت پر زور دیا لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ''وہ خطبات ان کا آخری فکری سرمایہ نہیں تھے۔ چنانچہ ان خطبات کے بعد ان کی جو خط و کتابت علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود عالم ندویؒ اور بعض دوسرے علماء سے ہوتی ہے اس سے ان کی اس سلسلے کی فکری تشنگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور خود ان کی پوری شاعری سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے غرض یہ کہ اس دوسرے محرک کے تحت اسلامی تشکیل جدید کی جو آواز سنائی دیتی ہے اس کی حیثیت اقبالؒ کی زبان میں یہ ہے

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازہ تجدید مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ''(۴۲)

غرض یہ کہ اجتہاد اگرچہ وقت کی اہم ضرورت ہے اور علماء کرامؒ وقت کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر دور میں پیش آئند مسائل کا حل اجتہاد کی روشنی میں پیش کرتے رہے ہیں۔ تاہم اجتہاد کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لئے کھول دیا جائے گا تو یہ نہ صرف دین و دنیا دونوں کی تباہی کا موجب ہوگا بلکہ اس کے برے نتائج کو دیکھ کر پھر اقبال کی طرح اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدار بر رفتگان محفوظ تر

مراجع وحواشی:

(۱) کمال فاروقی، ترجمہ مظہر الدین صدیقی، اجماع اور باب اجتہاد، ص۳، مطبوعات ادارہ تحقیقات اسلامی، کراچی، ۱۹۶۵

(۲) عتیق احمد بستوی، اجتہاد اور کارِ اجتہاد، ص۱۸، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۶

(۳) ایضاً، ص۱۹

(۴) علامہ اقبالؒ، ترجمہ وحید عشرت، تجدیدِ فکریات اسلام، ص۱۵۱، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۱ء

(۵) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ج۱، باب اسباب اختلاف الصحابۃ والتابعین فی الفروع

(۶) جلال الدین عمری، تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث، ص۱۳، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی، دسمبر ۲۰۱۰

(۷) سورۃ العنکبوت ،آیت ۶۹

(۸) **بخاری کتاب الاعتصام ،باب اجر الحاکم اذا اجتهدفاصاب او اخطاء**

(۹) **ابو دائود ، کتاب الاقضیة ،باب اجتهاد الرای فی القضاء**

(۱۰) تجدیدِ فکریات اسلام، ص۱۵۲

(۱۱) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مترجم محمد میاں صدیقی ،عقد الجید فی احکام الاجتھاد والتقلید ،ص۴۹، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۰

(۱۲) تجدیدِ فکریات اسلام، ص۱۵۲

(۱۳) تجدیدِ فکریات اسلام، ص۱۷۹

(۱۴) مودودی، ابوالاعلی، تجدید احیائے دین، ص۹۶، اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور، ۲۰۰۸

(۱۵) تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث، ص۲۸

(۱۶) تجدیدِ فکریات اسلام، ص۱۶۹

(۱۷) عصر حاضر کے تقاضے اقبال اور اجتہاد، مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید، ''سید حسین محمد جعفری'' ص۱۳۸، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، ۱۹۸۸ء

(۱۸) فکر اسلامی کی تشکیل جدید، محرکات اور ضرورت، مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید، مجیب اللہ ندوی ص۸۷

(۱۹) تجدیدِ فکریات اسلام، ص۱۵۲

(۲۰) تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث، ص۳۴
(۲۱) اجماع اور باب اجتہاد، ص۶
(۲۲) اشرف علی تھانویؒ، اشرف الجواب، ج۲، ص۳۱۰۔۳۱۲
(۲۳) اجتہاد اور کارِ اجتہاد، ص۳۲۸
(۲۴) ابوالاعلی مودودی، تفہیمات، ج۳، ص۲۱، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء
(۲۵) سعید احمد پالن پوری، فکر اسلامی کی تشکیل جدید (ضرورت اور لائحہ عمل)، ص۷۱ (ضرورت اور لائحہ عمل)، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۴
(۲۶) رشید احمد جالندھری، اسلامی قانون کے ارتقاء میں اجتہاد کا کردار، ص۱۱۷
(۲۷) تجدیدِ فکریات اسلام، ص۱۶۸
(۲۸) تفہیمات، ص۳۲
(۲۹) محمود عبدالقیوم ہزاروی، اسلام میں اجتہاد اور اس کی اہمیت
(۳۰) اجماع اور باب اجتہاد، ص۱۰
(۳۱) تجدیدِ فکریات اسلام، ص۱۷۷، ۱۷۸
(۳۲) محمود احمد غازی، محاضراتِ فقہ، ص۳۳۷، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۰۵ء
(۳۳) ایضاً، ص۳۳۸
(۳۴) تجدیدِ فکریات اسلام، ص۱۶۴
(۳۵) وحید الدین، فکر اسلامی افکار اسلامی کی تشریح و توضیح، ص۱۱، دارالتذکیر، لاہور، ۱۹۹۶
(۳۶) ایضاً، ص۳۸
(۳۷) محاضراتِ فقہ، ص۳۳۹
(۳۸) ایضاً
(۳۹) پروفیسر کرار حسین، عصری تقاضے اور خطباتِ اقبال، مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید، ص۱۳۴، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، ۱۹۸۸ء
(۴۰) تجدیدِ فکریاتِ اسلام، ۱۶۴
(۴۱) ایضاً
(۴۲) فکر اسلامی کی تشکیل جدید (محرکات اور ضرورت) مجیب اللہ ندوی، ص۸۷

معجزاتِ محمدِ عربی ﷺ ۔ایک جائزہ

سمیرا چشتی*

معجزہ کا لغوی مفہوم:۔

لفظ ''معجزہ'' کا مادّہ اشتقاق عجز، یعجز عجزاً ہے۔جس کے معنی کسی چیز پر قادر نہ ہونا، کسی کام کی طاقت نہ رکھنا یا کسی امر سے عاجز آ جانا وغیرہ ہیں۔

المفردات میں امام راغب اصفہانی معجزے کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عجز'' کے اصلی معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے یا اس کے ایسے وقت میں حاصل ہونے کے ہیں جبکہ اس کا وقت نکل چکا ہو۔عام طور پر یہ لفظ کسی کام کے کرنے سے قاصر رہ جانے پر بولا جاتا ہے۔

معجزہ کا اصطلاحی مفہوم:

مختلف ادوار میں ارباب علم وفن نے معجزہ کی مختلف تعریفات بیان کی ہیں۔

چند اہم تعریفات یہ ہیں:

۱۔ قاضی عیاض اپنی کتاب ''الشفاء'' میں معجزہ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''یہ بات بخوبی جان لینی چاہئے کہ جو کچھ انبیاءؑ اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں اسے ہم معجزے کا نام اس لیے دیتے ہیں کہ مخلوق اس کی مثل لانے سے عاجز ہوتی ہے۔''

۲۔ امام خازنؒ معجزہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''معجزہ اللہ کے نبی اور رسول کی طرف سے (جملہ انسانوں کے لیے) ایک چیلنج ہوتا ہے اور باری تعالیٰ کے اس فرمان کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ: میرے بندے نے سچ کہا، پس تم اس کی (کامل) اطاعت اور پیروی کرو، اس لیے کہ نبی ورسول کا معجزہ

---

*ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی

جو کچھ اس نے فرمایا ہوتا ہے اس کی حقانیت اور صداقت پر دلیل ناطق ہوتا ہے۔''(۱)

۳۔ علامہ شبلی نعمانی سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں معجزہ کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں!

''معجزہ اس خارق عادت چیز کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے پیغمبر کی تصدیق کے لیے صادر ہو۔''(۲)

مندرجہ بالا تعریفات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ

۱۔ معجزہ من جانب اللہ ہوتا ہے لیکن اس کا صدور اللہ کے برگزیدہ نبی کے ذریعے ہوتا ہے۔

۲۔ معجزہ مروجہ قوانین فطرت اور عالم اسباب کے برعکس ہوتا ہے۔

۳۔ معجزہ نبی و رسول کا ذاتی نہیں بلکہ عطائی فعل ہے اور یہ عطا اللہ رب العزت کی طرف سے ہوتی ہے۔

۴۔ معجزے کا ظہور چونکہ رحمانی اور الوہی قوت سے ہوتا ہے اس لئے عقل انسانی اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے اور حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی۔(۳)

حکماء کے نزدیک معجزہ اور سحر میں فرق:

ابن خلدون اپنے ''مقدمہ'' میں معجزہ اور سحر میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ معجزہ اور سحر میں ان کے نزدیک امر فارق یہ ہے کہ انبیاءؑ کے تمام اعمال اور افعال خیر و شر سے پاک اور منزّہ ہوتے ہیں اس لئے نبی اپنے خوارق سے کسی شر و قباحت کا باعث نہ ہوگا اور ساحر کے تمام کام نبی کے برخلاف مذموم و قبیح ہوں گے اور بغرض شرارت ہی کیے جاتے ہیں۔(۴)

اصطلاح معجزہ کی حقیقت:

اس ضمن میں سیرت النبیؐ کے مصنّف اور بعض اہل سیر نے لکھا ہے کہ ''معجزہ'' کا لفظ اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں کسی ایک مقام پر بھی استعمال نہیں کیا بلکہ متعدد دوسرے الفاظ کے ذریعے اس کے بنیادی تصور کو واضح کیا ہے۔ جیسا کہ

۱۔ آیۃ: (بمعنی نشانی یا علامت)

۲۔ مبصرۃ (بمعنی بیّن و واضح نشانی)

۳۔ بینۃ: (کھلی نشانی)

۴۔ برھان: (ایسی دلیل جو تمام دلائل سے وزنی ہو)

خارق عادت افعال کی اقسام:

علامہ طاہرالقادری نے اپنی کتاب ''فلسفۂ معراج النبیؐ'' میں ان خلاف معمول واقعات کو چار اقسام میں تقسیم کیا ہے:

۱۔معجزہ۔ ۲۔ارھاص ۳۔کرامت ۴۔استدراج

۱۔معجزہ:

جب کسی نبی اور رسول کو خلعتِ نبوت ورسالت سے سرفراز کیا جاتا ہے تو کفار ومشرکین دعویٰ نبوت کی صداقت کے طور پر اس سے دلیل طلب کرتے ہیں۔اس پر قدرت خداوندی سے جو خارق عادت واقعہ اس نبی یا رسول کے دست حق پرست سے صادر ہو،اسے ''معجزہ'' کہتے ہیں۔(۵)

۲۔ارہاص:

ارہاص سے مراد کسی عظیم روحانی شخصیت کی ولادت سے پہلے بعض ایسے شواہد جو اہل روحانیت اور اہل کشف کے سامنے آنے لگیں،ان علامات اور چیزوں کو''ارہاص'' کہتے ہیں۔(۶)

یعنی وہ خلاف معمول واقعات یا عجائبات جن کا ظہور کسی نبی یا رسول کی ولادت باسعادت کے وقت یا پیدائش سے پہلے ہو''ارہاص'' کہلاتا ہے۔ان واقعات کا رونما ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ پیدائش غیر معمولی پیدائش ہے مثلاً حضور رحمت عالم ﷺ کی ولادت سے پہلے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آسمان سے ستارے سائبان کی طرح زمین پر اتر آئے ہیں۔ سیدۂ بی بی آمنہؓ کا ارشاد گرامی ہے کہ حضورؐ کی پیدائش کے وقت میں نے سرزمین مکہ سے ہزاروں میل دور واقع شام کے محلات دیکھے اور اپنے اردگرد خوشبوئیں محسوس کیں۔یہ تمام واقعات''ارہاص'' کہلاتے ہیں۔

۳۔کرامت:

کرامت ان خارق عادت افعال کو کہتے ہیں جو مومنین صالحین اور اولیائے کرام کے ہاتھوں اللہ صادر فرماتا ہے۔ مثلاً سیدنا سلمانؑ کے صحابی حضرت آصف برخیا کا پلک جھپکنے سے قبل ملکہ سبا کا تخت آپ کی خدمت میں پیش کر دینا۔

۴۔استدراج:

یہ وہ خلاف عادت افعال ہوتے ہیں جو کسی کافر،مشرک، فاسق، فاجر اور ساحر کے ہاتھ سے صادر ہوں۔مثلاً: حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں سامری جادوگر نے سونے کا بچھڑا بنا کر اس کے منہ سے آواز پیدا کر لی جس کے نتیجے میں بنی

اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کردی۔اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے دعویٰ نبوت کو چیلنج کرتے ہوئے فرعون کے دربار میں جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں زمین پر پھینکیں تو وہ اژدھا بن گئیں۔اس قسم کے تمام اعمال ''استدراج'' کی ذیل میں آتے ہیں۔(۷)

معجزہ کی ضرورت کب ہوتی ہے:

کسی نبی سے اس کی نبوت کے ظاہری آثار وعلامات یعنی معجزات صرف وہ فرقہ طلب کرتا ہے جس کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں اور جو تعصب وعناد اور جہل کے باعث حق ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

چنانچہ انبیاء کرام پر ایمان لانے والوں کے حالات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ معجزات کی طلب نیکو کاروں نے نہیں کی جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے ابوبکرؓ وعمرؓ نے معجزات طلب نہیں کیے بلکہ سرداران قریش وکفار قریش ابوجہل وابولہب نے معجزاب طلب کیے۔

قرآن کریم نے اس حقیقت کو پوری طرح تصریح کی ہے اور طلب معجزہ کے سوال کو ہمیشہ کفار کی طرف منسوب کیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْتَاْ تِيْنَآ اٰيَةٌ'' ط (سورۂ بقرۃ:۱۱۸)

ترجمہ:''اور (جن کو کتاب الٰہی کا) علم نہیں یعنی (کفار قریش) کہتے ہیں کہ کیوں خدا ہم سے خود بات نہیں کرتا، یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔''

معجزات کی اقسام:

اپنی کتاب ''معجزات رسول اکرمؐ'' میں مفتی عنایت احمد نے معجزات کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ معجزات عملیہ ۲۔معجزات علمیہ معجزات عملیہ

معجزۂ عملی اس کو کہتے ہیں کہ نبی کے ہاتھ سے ایسا عمل یا کام ظاہر ہو کہ اس جیسا کام کرنے سے سب عاجز آجائیں۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کا معجزہ شق القمر۔

معجزات علمیہ:

اور معجزات علمی اس کا نام ہے کہ نبی سے ایسے علوم اور معارف ظاہر ہوں کہ ساری دنیا اس کے مثل لانے سے عاجز

ہو۔جیسا کہ آنحضرتؐ کے معجزات میں سے سب سے بڑا علمی معجزہ قرآن کریم ہے۔(۹)

معجزات محمد عربی ﷺ:

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو اپنی قدرت کاملہ سے معجزات عطا فرمائے۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیؐ کو بھی اللہ تعالیٰ نے نبوت کی دلیل کے طور پر بے شمار معجزات سے نوازا۔

نبی کا ہر قول اور فعل من جانب اللہ ہوتا ہے۔اس سلسلے میں خود اللہ پاک فرماتا ہے کہ:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَاِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى (النجم:۔۴۔۳)

ترجمہ:''آنحضرتؐ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ خدا ہی کے ارشاد پر مبنی ہے۔''

تو چاہے معجزہ عملی ہو یا علمی، درحقیقت یہ نبوت کی دلیل ہوتا ہے اور یہ اللہ کا انعام اور فضل ہے کہ تمام انبیاء کو معجزات عطا ہوئے حضورؐ کو جو علمی معجزہ (قرآن مجید) عطا ہوا وہ ابدی ہے اور تا قیامت قائم و دائم رہے گا۔ چونکہ معجزہ نبوت کی دلیل اور نشانی ہوتا ہے تو آج جس نبوت کی دلیل (قرآن مجید) موجود ہے وہ نبوت بھی موجود ہے۔لہٰذا آنحضرت ﷺ کی نبوت قیامت تک باقی رہے گی۔(۱۰)

آنحضرت ﷺ کے معجزات کی تعداد:

جہاں تک آنحضرتؐ کے معجزات کی تعداد کی بات ہے تو امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے معجزات ایک ہزار تک پہنچے ہیں۔امام نووی معجزات رسولؐ کی تعداد ایک ہزار دو سو بتاتے ہیں جبکہ بعض علماء نے آپؐ کے معجزات کی تعداد تین ہزار ذکر فرمائی ہے اور آئمہ نے معجزات نبویؐ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جیسے امام بیہقی اور امام ابونعیم کی دلائل النبوۃ۔

اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص الکبریٰ کے نام سے ایک مستقل کتاب آپؐ کے معجزات سے متعلق لکھی ہے، جس میں ایک ہزار معجزات کا ذکر ہے۔

اور حق تو یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے معجزات شمار سے متجاوز ہیں، اس لیے کہ آپؐ کا ہر قول، ہر فعل اور ہر حال عجیب و غریب مصالح اور اسرار و حکم پر مشتمل ہونے کی وجہ خارق عادت ہے اور معجزہ ہے۔(۱۱)

لیکن بدقسمتی سے تاریخ اسلام میں متعدد مشہور مگر غیر مستند واقعات اور روایات کو مستقل بنیادوں پر شامل کر دیا گیا ہے۔اور یوں معجزات کی تعداد طویل سے طویل تر ہوگئی ہے اور واعظ اور خطیب حضرات انہیں زیب داستان کے طور پر یا گرمیِ

محفل کے لیے بالعموم بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ جو باتیں نبی ﷺ سے سنداً صحیح ثابت نہیں، انہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرکے بیان کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس پر جہنم کی وعید وارد ہے۔

ڈاکٹر این میری شمل نے اپنی کتاب ''محمد رسول اللہ'' میں ایک باب ''معجزے اور افسانوی داستانیں'' کے نام سے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ قرآن حکیم کے مفسروں، مبلغوں، قصہ گووں اور تمام صوفیوں اور شعراء کو قرآن کریم سے خاصا مواد مل گیا ہے جس کی مدد سے انھوں نے ایسے معجزات اور افسانوی داستانیں وضع کرلی ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ کے تقریباً تمام سوانح نگاروں کے لیے ضروری اجزاء کی حیثیت اختیار کرگئی ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد کی صدیوں، خصوصاً مسلم جدت پسندوں نے پیغمبرانہ معجزوں پر بھروسہ کرنے کے خطرے کو محسوس کرلیا۔ چناں چہ انہوں نے رسالت مآب ﷺ کی حیات طیبہ کو افسانوں اور داستانوں سے الگ کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ سرسید احمد خان نے مقالات میں اس ضمن میں اس عنوان سے مضمون باندھا ہے: کیا معجزہ دلیل نبوت ہے؟ (۱۲) سرسید احمد خان نے اس مضمون میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اہل ایمان یا جو لوگ ہدایت یافتہ ہوں وہ نبی کو بغیر کسی معجزہ کی طلبی کے نبی مان لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جن کے دلوں پر قفل پڑے ہیں اور عقلوں پر پردے ہیں وہ لوگ معجزات کے طلب کرنے کے باوجود ایمان نہیں لاتے۔

سرسید احمد خان، مقالات سرسید میں لکھتے ہیں کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ انبیا پر ایمان لانا بہ سبب ظہور معجزات کے ہوتا ہے مگر یہ خیال غلط ہے بلکہ انبیاء پر یا کسی ہادیٔ باطل پر ایمان لانا بھی انسانی فطرت میں داخل اور قانون قدرت کے تابع ہے۔ بعض انسان از روئے فطرت ایسے سلیم الطبع پیدا ہوتے ہیں کہ سیدھی اور سچی بات ان کے دل میں بیٹھ جاتی ہے اور وہ اس پر یقین کرنے کے لیے دلیل یا معجزہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ ان کے دل میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اس بات کے سچ ہونے پر ان کو یقین دلاتی ہے یہی لوگ ہیں جو انبیائے صادقین پر صرف ان کا وعظ و نصیحت سن کر ایمان لاتے ہیں نہ کہ معجزوں اور کرامتوں کے دیکھنے کے بعد۔

مگر جو لوگ معجزوں کے طلبگار ہوتے ہیں وہ کبھی ایمان نہیں لاتے اور نہ معجزوں کے دیکھنے سے کوئی ایمان لاسکتا ہے۔ خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ

''اگر تو زمین میں ایک سرنگ ڈھونڈ نکالے یا آسمان میں ایک سیڑھی لگالے تب بھی وہ ایمان لانے کے نہیں۔''

اورایک جگہ فرمایا کہ

''اگر ہم کاغذوں پر لکھی ہوئی کتاب بھی بھیج دیں اوراس کووہ اپنے ہاتھوں سے بھی چھولیں تب بھی وہ ایمان لانے کے نہیں اور کہیں گے کہ یہ تو جادو ہے۔''

بس ایمان لانا صرف ہدایت (فطرت) پر منحصر ہے(۱۳)

لیکن سرسید احمد خان نے معجزات کو افسانوں اور داستانوں سے الگ کرنے کی کوشش میں معجزات کی ضرورت سے ہی ایک طرح سے انکار کردیا اور عقلی اور منطقی بنیادوں پر نبوت کے لیے دلائل و براہین کی سرے سے ضرورت کے ہی قائل نہیں رہے۔

سرسید نے جن آیات کا حوالہ دیا ہے ان سے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ کفار معجزہ طلبی کے باوجود کسی صورت بھی ایمان نہیں لاسکتے اور رہے متقی اور صاحب ہدایت افراد تو ان کو معجزات کی ضرورت ہی نہیں۔

تو یہاں یہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ طے شدہ قانون ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو معجزات عطا ہی کیوں کیے۔ معجزات کی آخر ضرورت ہی کیا تھی؟ جبکہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور دین اسلام فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

سرسید احمد خان نے جن آیات کا حوالہ دیا ہے اس کے پس منظر کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ اکثر مومنین کی قلت پر غمگین ہوا کرتے تھے اور مشرکین مکہ کے اسلام نہ لانے کی وجہ سے فکر میں مبتلا رہتے تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ جن (مخصوص طبقے کے افراد) کے لیے آپؐ فکرمند ہیں ان کے لیے خود کو پریشان اور ہلکان نہ کریں کیونکہ یہ لوگ کسی صورت ایمان نہیں لائیں گے۔

گویا یہ آیات ان مخصوص افراد اور گروہ کے ایمان نہ لانے کی وعید دے رہی ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ آپؐ کچھ بھی کرلیں یہ لوگ سب کے سب کسی صورت ایمان نہیں لاسکتے۔

گزشتہ صفحات میں جب ہم نے معجزہ کی تعریف کے ضمن میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ معجزہ من جانب اللہ ہوتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی امر بغیر کسی مصلحت یا وجہ کے ممکن ہے؟ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ واقعہ معراج کے بعد قریش کے کئی افراد آپؐ کے اس معجزے کی محض روئیداد سن کر ایمان لے کر آئے تھے۔

البتہ یہ حقیقت مسلمہ ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ اسلامی تاریخ میں متعدد ایسی غیر مستند روایات نے